المنقذ من الضلال

20

اردو

مصنفہ

حجۃ الاسلام حضرت محمد بن محمد الغزالی الطوسی رحمۃ اللہ علیہ

مترجمہ

خلیل العلماء حضرت مولانا مفتی محمد خلیل خاں صاحب قادری برکاتی
صدر المدرسین مدرسہ احسن البرکات حیدرآباد پاک

دین و دنیا بک ڈپو شاہی بازار حیدرآباد سندھ پاک

باراول
۱۹۵۹ء

قیمت تین روپے 3/-

طابع و ناشر:۔ محمد حسین اعجازی برائے
کتب خانہ دین و دنیا شاہی بازار حیدر آباد پاکستان

مطبوعہ
سعید آرٹ پریس حیدر آباد

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی

قدس سرہ العالی

اس رتبہ کے شخص تھے کہ ایک مدت تک ان کی تصانیف کا یورپ میں بھی چرچا رہا اور بہت سے نامور مصنفوں نے ان کی تصانیف پر شروح اور حواشی لکھے۔

فلسفہ کی جو تاریخیں لکھی گئیں اُن میں امام صاحب کا ذکر خاص طور پر لایا گیا۔ اور بعض کتابیں خاص امام صاحب کی تصانیف کے متعلق تحریر میں آئیں۔

آئینۂ مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحات

صفحات	مضمون	نمبر شمار
۱۲۲	بعض تصانیفِ امام کا تذکرہ	۴۹
۱۲۵	باطنیہ کا ماخذ فلسفۂ فیثا غورث ہے	۵۰
۱۲۹	چھٹا مقالہ	۵۱
۱۲۹	صوفیائے کرام کا مسلکِ محقق۔	۵۲
۱۳۲	علمِ تصوف حال چاہتا ہے کہ قال۔	۵۳
۱۳۵	امام صاحب کا مشاغل سے اعراض۔	۵۴
۱۳۶	نفسیاتی جنگ	۵۵
۱۳۸	بغداد سے روانگی۔	۵۶
۱۴۱	ملکِ شام میں قیام	۵۷
۱۴۱	دمشق و بیت المقدس میں مجاہدات۔	۵۸
۱۴۲	حج بیت اللہ وزیارت نبوی۔	۵۹
۱۴۴	تصوف وسلوک بارگاہ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔	۶۰
۱۴۵	وارداتِ قلب۔	۶۱
۱۵۳	ساتواں مقالہ	۶۲
//	حقیقتِ نبوت۔	۶۳
۱۵۵	حواسِ خمسہ سے تمام معلومات حاصل نہیں ہوسکتے	۶۴
۱۵۹	نبوت میں شکوک۔	۶۵
۱۶۰	مدرکاتِ نبوت۔	۶۶

نمبر شمار	مضمون	صفحات

حواشی و اضافات

نمبر شمار	مضمون	صفحات

تعارف

انسان سے غلطی ہونا کچھ عجیب نہیں۔ دانا و فرزانہ انسان لبا اوقات خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب انھیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری کوششیں مفید نہیں، بلکہ مضر نتیجے پیدا کر سکتی ہیں تو فوراً اس کا تدارک کرتے اور حصول مقاصد کے لئے دوسرا مفید اور بے ضرر راستہ تلاش کرتے اور اپنی منزل پا لیتے ہیں۔

میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ خود بھی اپنے ماحول کا جائزہ لیں گے، اور جواب دینے میں جلدبازی یا سخن پروری سے کام نہ لیں گے۔ سوال یہ ہے کہ مغربی علوم نے ہمیں کیا دیا، یا ہم نے اُن سے کیا پایا۔؟

مجھے آپ کے جواب سے غرض نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو چکی ہے

کہ اِن "علوم" نے ہمیں مجسم جہالت بنا دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ:
"علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است"

انگریزی تعلیم ہی کی یہ برکات ہیں کہ آج دین و ملت کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ احکامِ اسلام پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ علمائے اسلام، جو ان خرافات کا ساتھ نہیں دیتے اُنھیں "غیر مہذب" اور اسلامی روایات کو، جو اس آزادی سے روکتی ہیں "جاہلیت" ٹھہرایا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا، غلطی ہوتی ہے تو اس کا تدارک بھی ہو سکتا ہے۔ پھر آپ کی یہ غلطیاں تو خطرناک قسم کی غلطیاں ہیں۔

للہ انصاف! کیا کسی کو زیب دیتا ہے کہ وہ اِن حالات میں دعوائے اسلام کرے۔

تہافتہ الفلاسفہ کے دیباچہ میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا کہ:-

"ہمارے زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو گمان ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور شرائع اسلام کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکماء و عقلاء قدیم مثلاً افلاطون ارسطو وغیرہ (اور زمانۂ حدیث میں نیوٹن و ڈارون وغیرہ) دین و ملت کو لغو سمجھتے تھے اور چونکہ یہ حکما و تمام علوم و فنون کے بانی و موجد تھے اور عقل و ذہن میں اُن کا کوئی ہمسر نہیں ہوا اس لئے ان کا انکار مذہب اس بات کی دلیل تھی

ہے کہ مذہب (معاذاللہ) حقیقت میں لغو اور باطل ہے اور اس کے
اصول و قواعد فرضی اور مصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوشنما و دلفریب
ہیں۔ اِس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الٰہیات وغیرہ پر
جو کچھ لکھا ہے ان کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ اُن کے
مسائل و اُصول بازیچۂ اطفال ہیں۔"

چونکہ یہ حالات ہمارے زمانہ کے حالات سے ملتے جلتے ہیں
اس لئے ہم امام صاحب کی اس کتاب کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ناشر

مُقدمۃ الکتاب

حجۃ الاسلام محمد بن محمد الغزالی الطوسی
قدس اللہ سرہٗ

نام نامی محمد، کنیت ابو حامد، لقب زین العابدین وحجۃ الاسلام اور عرف غزالی ہے۔

خراسان کے اضلاع میں ضلع طوس کے شہر طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد چونکہ رشتہ فروش تھے۔ اس لئے ان کا خاندان غزالی کہلاتا تھا۔ کیونکہ عربی میں غزل کے معنی کاتنے کے ہیں۔

جس زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اُس زمانہ میں خانگی درسگاہیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے نامور علماء واساتذہ اپنے گھروں یا مسجدوں میں بیٹھ کر بلا معاوضہ درس دیتے تھے۔ طلبہ کے مصارف کا بندوبست شہر کے امراء و رؤسا کی طرف سے کیا جاتا تھا

اس لئے تعلیم عام تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ والے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم نہیں رہتے تھے۔ لیکن اتفاقِ وقت کہ امام صاحب کے والد تعلیم حاصل نہ کر سکے، لیکن اولاد کی طرف سے غافل نہ تھے۔ انتقال کا وقت آیا تو اپنے ایک دوست کو بلا کر وصیت کی کہ محمد اور احمد میرے دو بیٹے ہیں۔ میں اُنھیں آپ کے سپرد کرتا ہوں تاکہ آپ اُن کی تعلیم کا بندوبست کردیں۔ ساتھ ہی تعلیمی مصارف کے لئے کچھ رقم دیدی۔

چنانچہ اُن کے انتقال کے بعد اُن بزرگ نے امام صاحب کو تعلیم دلانا شروع کی۔ لیکن جب وہ رقم صرف ہو گئی تو اُن بزرگ کے ایما سے آپ ایک مدرسہ میں داخل ہو گئے۔

امام صاحب نے فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے ہی شہر کے ایک بزرگ احمد بن محمد اذکانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد جرجان پہنچ کر امام ابو نصر اسماعیل کی خدمت میں تحصیل شروع کی۔

چند روز کے بعد وطن کو واپس آئے۔ اتفاق سے راستہ میں ڈاکہ پڑا اور دوسرے سامان کے ساتھ وہ تعلیقات یعنی یادداشتیں بھی لٹ گئیں جو امام ابو نصر نے لکھائی تھیں۔ جب ان یادداشتوں کو واپس لینے کے لئے آپ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے تو وہ ہنسا اور کہا "تم نے خاک پڑھا، جبکہ تمھاری حالت یہ ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے" یہ کہہ کر کاغذ واپس کر دیئے۔ لیکن اس کے

طعنہ آمیز فقرے نے امام صاحب پر وہ اثر کیا کہ آپ نے وطن پہنچ کر پورے تین برس صرف کرکے اُن یادداشتوں کے تمام مسائل کو حفظ کر لیا۔

اب امام صاحب کے علمی شوق نے پھر آپ کو ترکِ وطن پر اُبھارا، اور تکمیل علوم کے لئے آپ نے نیشاپور کا سفر کیا۔ یہ آپ کے وطن سے قریب بھی تھا، اور امام الحرمینؒ جن کا اصلی نام عبد الملک اور لقب ضیاء الدین تھا، یہاں درس دیتے تھے۔ امام صاحب نے امام الحرمین کی خدمت میں پہنچ کر نہایت جد و جہد سے علم کی تحصیل شروع کی۔ یہانتک کہ تھوڑی ہی مدت میں تحصیل سے فارغ ہو کر اقران میں ممتاز ہو گئے۔ چنانچہ امام الحرمین خود فرمایا کرتے تھے کہ "غزالی دریائے ذخار ہے"

یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کو نائب مدرس مقرر کر دیا گیا اور آپ کا کام یہ تھا کہ امام الحرمین درس دے چکتے تھے تو آپ باقی طلبہ کو استاد کے بتائے ہوئے مضامین اچھی طرح ذہن نشین کراتے تھے۔

امام الحرمین نے ۴۷۸ھ وفات پائی۔ اور اُن کے انتقال کے بعد امام صاحب نیشاپور سے اس شان سے نکلے کہ تمام بلادِ اسلامیہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ اور اُس وقت آپ کی عمر صرف ۲۸ برس کی تھی

جیسا کہ آپ کو اسی کتاب سے معلوم ہوگا، امام صاحب کا مزاج ابتدا میں وجاہت پسند تھا۔ اور اس جاہ ومنصب کی امید میں آپ نے درسگاہ سے نکل کر نظام الملک کے دربار کے قصد سے بغداد کا رُخ کیا۔ چُونکہ آپ کی علمی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی، اس لئے نظام الملک نے نہایت تعظیم وتکریم سے ان کا استقبال کیا۔

نظام الملک کے دربار میں اس وقت سینکڑوں اہل کمال کا مجمع تھا۔ اس لئے علماء وفضلا سے مسائلِ علمی پر متعدد بحثیں رہیں مختلف مضامین زیر بحث آئے، اور خدا کی شان کہ ان مناظرانہ گفتگوؤں میں امام صاحب ہی غالب آئے۔ اس کامیابی نے تمام اطراف ودیار میں امام صاحب کی شہرت کو چمکا دیا۔ اور نظام الملک نے آپ کو نظامیہ کی مسند درس کے لئے منتخب کر لیا۔

امام صاحب کی عمر اس وقت ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ۴۸۴ھ کا زمانہ تھا۔ اس کے ایک سال بعد ملک شاہ سلجوقی نے وفات پائی۔

اس زمانہ میں اسلام کے جاہ وجلال کے دو مرکز تھے۔ خاندانِ سلجوقی اور آلِ عباس۔ اور امام صاحب دونوں درباروں میں نہایت وقعت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔

آلِ عباس میں اس وقت بغداد کے تخت خلافت پر خلیفہ مقتدر باللہ نے وفات پائی اور خلیفہ مستظہر باللہ خلافت کے لئے پیش کیا گیا، تو اس کی بیعت میں اور ارکین سلطنت کے ساتھ امام غزالی بھی شریک تھے۔ فرقہ باطنیہ نے جب زور پکڑا تو خلیفہ مذکور نے امام صاحب کو حکم بھیجا کہ ان کے رد میں کتاب لکھیں۔ چنانچہ امام صاحب نے خلیفہ ہی کے نام پر ایک کتاب "مستظہری" لکھی۔

چونکہ امام صاحب ابتدا ہی سے ایک خاص قسم کی طبیعت رکھتے تھے، اسی لئے اُن کے سامنے جس قدر مذہبی فرقے تھے اُن میں سے ایک ایک فرقہ اور اہلِ مذہب سے ملے، اور اُن کے خیالات سنے اور بیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک یہ شغل رہا کہ باطنی ظاہری، فلسفی، متکلم، صوفی، زندیق ایک ایک سے ملے اور ایک ایک کے عقائد کا سُراغ لگایا۔

اسی سلسلہ میں جب آپ نے تصوف کی طرف توجہ کی اور اس فن میں حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی، امام ابوبکر شبلی، سلطان بایزید بسطامی رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے ملفوظات اور دیگر مشائخ کرام کی تصنیفات کا مطالعہ کیا تو دنیا کی دلفریبیوں کا صحیح نقشہ نظروں میں گھوم گیا۔ اور آپ نے فیصلہ کر لیا کہ درس

و تدریس بھی شہرت طلبی کا ایک ذریعہ ہے، اور نجات آخرت اس سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ان خیالات نے ترک وطن پر آمادہ کیا، اور آپ تمام تعلقات سے دست بردار ہو کر ابن خلکان کی روایت کے مطابق ذو قعدہ ۴۸۸ھ میں بغداد سے نکل پڑے۔

اللہ اللہ! ایک وقت تو وہ تھا کہ نظامیہ بغداد کی صدارت کے بعد آپ اپنے زمانہ کے اہل علم سے دولت، ثروت، عزت و احترام میں بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ اور اراکین سلطنت تک ان کی خدمت و حضوری کو باعث فخر سمجھتے تھے یا آج یہ عالم ہے کہ زر نگار عبا و قیمتی جبہ و پر تکلف لباس کی بجائے بدن پر ایک کمبل ہے تو ہاتھ میں شام لگی ہوئی لٹھیا۔ اور پیٹھ پر ڈوری سے بندھا ہوا تام لوٹا۔ لذیذ غذاؤں کی جگہ ساگ پات پر گذران

بعض روایتوں میں ہے کہ امام صاحب مدت سے ترک دنیا کا ارادہ کر رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی جو صوفی اور صاحب حال تھے آ نکلے اور یہ شعر پڑھا:

وَاَصْبَحْتَ تَهْدِیْ وَلَا تَهْتَدِیْ
وَتُسْمِعُ وَعْظًا وَلَا تَسْمَعُ

تم دوسروں کو ہدایت کرتے ہو لیکن خود راہ راست پر نہیں آتے۔ اوروں کو وعظ سناتے ہو خود نصیحت قبول نہیں کرتے

غرض بغداد سے نکل کر شام کا رُخ کیا۔ اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہوئے۔ لیکن علمی اشغال یہاں بھی ترک نہ ہوئے۔ جامع اموی کے غربی زاویہ میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔

دو برس کے بعد دمشق سے بیت المقدس کا قصد کیا۔ یہاں بھی یہ شغل رہا کہ صخرہ کے حجرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے اور مجاہدہ کیا کرتے۔ علمی اشغال میں یہاں بھی مصروف رہتے تھے۔ رسالہ قواعد العقائد بیت المقدس والوں ہی کی فرمائش پر تحریر فرمایا۔

قریب قریب دس سال کی یہ مدت سیر و سیاحت، حج و زیارت، مجاہدہ و ریاضت میں بسر ہوتی ہے۔ اور جب اس حال سے افاقہ میسر آتا ہے تو وطنِ مالوف لوٹتے ہیں، اور یہاں پہنچ کر پھر عزلت و خلوت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن زندگی کی ضروریات اور معاشی حالات نے قلب کو مکدر کر دیا۔ دلجمعی اور اطمینان کا وقت جستہ جستہ ہاتھ آتا تھا۔

حسنِ اتفاق کہ اسی زمانہ میں سلطانِ وقت کا حکم پہنچا کہ درس و افادہ کی خدمت قبول کیجئے۔ احباب نے بھی ترکِ عزلت کی رائے دی۔ بعض صالحین کو خواب میں القا ہوا کہ یہی امر خدا کی خوشنودی کا باعث ہے۔ چنانچہ ذوقعدہ ۴۹۹ھ میں

امام صاحب نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں مسند درس کو زینت دی۔ اور بدستور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

لیکن محرم ۵۰۰ھ میں نظام الملک کے بیٹے فخرالملک کے ایک باطنی کے ہاتھ شہید ہو جانے کے تھوڑے ہی دن بعد امام صاحب نے عہدۂ تدریس سے کنارہ کشی کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی اور گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔

ابن جوزی نے اس مدرسہ اور خانقاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

عَادَ اِلٰی وَطَنِہٖ وَاتَّخَذَ فِیْ جِوَارِہٖ مَدْرَسَۃً وَرِبَاطًا لِلْمُتَصَوِّفَۃِ وَبَنٰی دَارًا حَسَنًا وَغَرَسَ فِیْھَا بُسْتَانًا۔

یعنی "اپنے وطن واپس آئے تو وہاں ایک مدرسہ اور تصوف سیکھنے والوں کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کی۔ ایک خوبصورت مکان بنایا جس میں ایک باغ بھی لگایا تھا۔

امام صاحب نے جب نظامیہ چھوڑا تھا تو اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا نائب مقرر کر گئے تھے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ نظامیہ کا اثر جاتا رہا۔ خلیفۂ بغداد کو اس کا بہت خیال تھا۔ اس لئے اُس نے امام صاحب کو دوبارہ نظامیہ کی مدرسی کے لئے دعوت کی لیکن آپ نے بلطائف الحیل ٹال دیا اور گوشۂ عافیت سے

باہر نہ نکلے۔

تصنیف وتالیف کا مشغلہ اب بھی ترک نہ ہوا۔ اصولِ فقہ میں "مستصفیٰ" جو ان کی بہترین تصنیف ہے ۵۰۴ھ کی تصنیف ہے۔ جس سے ایک سال بعد امام صاحب نے انتقال کیا۔ اور ۵۵ سال کا یہ زمانہ ۵۰۵ھ میں ختم ہو گیا۔

ابن جوزی نے آپ کے وصال کا واقعہ اُن کے بھائی حضرت احمد غزالی کی روایت سے یوں لکھا ہے کہ:

"پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بسترِ خواب سے اُٹھے وضو کیا۔ نماز ادا کی۔ پھر کفن منگایا۔ آنکھوں سے لگایا اور عرض کیا:۔

"بندہ بسر وچشم حاضر ہے"

اور دوسرے عالم کے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔

بعض تلامذہ نے وصیت کی فرمائش کی تو فرمایا:

عَلَيْكَ بِالْإِخْلَاصِ عَلَيْكَ بِالْإِخْلَاصِ عَلَيْكَ بِالْإِخْلَاصِ

اخلاص کو لازم کر لو اخلاص کو پیش نظر رکھو نیت میں خلوص پیدا کرو۔

کہتے ہیں کہ اخلاص کے اسی آخری وعظ کو دُہراتے ہوئے وفات پا گئے اور حالت یہ تھی کہ سینے پر بخاری شریف رکھی ہوئی تھی۔

یعنی وہ آپ کا آخری قول تھا اور یہ آخری فعل۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

امام صاحب کی عمر دیکھئے پھر اُن کے مشاغل پر نگاہ ڈالئے حیرت ہوتی ہے کہ ۵۵ سال کی عمر اور تصانیف کی یہ مقدار و کمیت پھر اس پر یہ حیثیت و نوعیت۔

"احیاء العلوم" ہی کو لیجئے۔ معلومات کا جو ذخیرہ آسان و سلیس عبارت میں اس کتاب میں بھرا پڑا ہے مشکل اور کتابوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ طرزِ تقریر اتنا پیارا اور ایسا دلنشین کہ شاید و باید۔ کتاب اُٹھا کر پڑھنا شروع کیجئے تو معلوم ہو گا کہ بارانِ رحمت کے نورانی قطرے صحیفۂ قلب پر برس رہے ہیں۔ اور روح عالم بالا کی سیر میں مصروف ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ جنھیں ایک زمانہ جانتا اور مانتا ہے اسی کتاب احیاء العلوم کو صحنِ مسجد حرام میں کعبۂ مقدسہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

شیخ ابوالحسن شاذلی قدس سرہٗ کہ قطب زمانہ گذرے ہیں ایک روز اسی مبارک کتاب کو ہاتھ میں لئے ہوئے ارشاد فرما رہے تھے کہ یہ وہ کتاب ہے جو بارگاہ رسالت میں اس درجہ مقبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہے کہ اس کتاب کے منکر کے لئے دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوڑوں کا حکم صادر ہوا ہے۔

نفحات الانس شریف کی شہادت ہے کہ "چنانچہ اثر سوط تا وقتِ مردن بر تنِ وے ظاہر بود" مرتے دم تک اُس شخص کے بدن پر کوڑوں کا نشان باقی رہا۔

غرض یہ کہ فقہ و کلام و تصوف وغیرہ میں اُن کی تصنیفات بیش بہا معلومات کے خزانے اور علمائے اسلام کی علمی ترقیوں کے قیمتی نمونے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام و صوفیائے عظام دونوں کو جس قدر اہتمام و اعتنا آپ کی تصانیف کے ساتھ ہے کہیں اور نظر نہیں آتا۔

آپ کی تصانیف کی تعداد اور روزانہ تصنیف کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ نووی نے ایک مستند شخص سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام غزالی کی تصانیف اور اُن کی عمر کا حساب لگایا تو روزانہ اوسط چار کراسہ پڑا۔

کراسہ چار صفحوں کا ہوتا ہے اس حساب سے ۱۶ صفحے روزانہ ہوئے۔ بعض کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں۔

نفحات الانس شریف میں آپ کی تصانیف میں تفسیر "یاقوت التاویل" کا شمار کرتے ہوئے تحریر فرمایا "و تفسیر یاقوت التاویل چہل مجلد" یعنی آپ کی یہ کتاب چالیس جلدوں میں تھی۔

بالجملہ آپ کی ہر تصنیف گوناگوں مضامین سے پُر، اور

اپنے باب میں بے نظیر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُس زمانہ کے مروجہ علوم و فنون میں کوئی فن ہوگا جس میں اُن کی کوئی کتاب نہ ہو۔

عربی زبان کے علاوہ فارسی زبان میں آپ کی مشہور کتاب "کیمیائے سعادت" آپ کے تبحر علمی کا پتہ دیتی ہے۔

غرض حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک ہی وقت میں بہت بڑے فقیہ، علم اصول فقہ کے ماہر، بہت بڑے مدرس، بہت بڑے مصنف، بہت بڑے لیکچرار اور بہت بڑے مناظر تھے۔ اور اس کی شہادت ان کی تصانیف سے ملتی ہے۔

مشہور ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما پر حب موسیٰ کلیم اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے امام صاحب سے فرمایا کہ مَنْ اَنْتَ۔ تم کون ہو؟ آپ نے عرض کیا "محمد بن محمد الغزالی" موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تم سے صرف تمہارا نام پوچھا تھا۔ تم نے اپنے آب وجد کا نام بھی بتلا دیا۔ اور اپنی نسبت بھی ظاہر کر دی۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ آپ نے عرض کیا کہ جب آپ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے تھے، تو

آپ سے صرف یہ پوچھا گیا تھا کہ موسیٰ "مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ" تمھارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے ؟ آپ نے نہ صرف یہ عرض کیا کہ "هِيَ عَصَايَ" یہ میری لاٹھی ہے۔ بلکہ ساتھ ہی یہ عرض کیا کہ "میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور میرے اس میں اور کام ہیں" تو آپ فرمائیں اس میں کیا حکمت تھی ؟ فرمایا "لذتِ ہمکلامی" عرض کیا یہی یہاں تصور فرمائیں۔

حضرت مولانا الجامی قدس سرہٗ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ یہ واقعہ ہے افسانہ نہیں۔

نفحات الانس میں فرمایا کہ "شیخ ابوالحسن شاذلی قدس اللہ تعالےٰ روحہٗ کہ قطب زمانہ بود از واقعہ کہ دید چنیں خبر دادہ است کہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم با موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام مفاخرت ومباہات کردہ ست بغزالی رحمۃ اللہ تعالےٰ۔"

تصانیف کے ساتھ ساتھ امام صاحب کے تلامذہ بکثرت کثیرہ تھے۔ اسی کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مدرسہ نظامیہ میں تقریباً تین سو طلبہ آپ سے علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

اپنی وفات تک آپ کے تلامذہ کی تعداد ایک ہزار

بیان کی جاتی ہے۔ ان میں دو قسم کے طلبہ تھے۔ ایک وہ کہ آپ سے علوم ظاہری پڑھتے تھے اور ان میں سے بعض ان علوم میں اپنے اپنے وقت کے امام ہوئے۔

ان میں ابو الحسن علی بن مظہر دینوری اور ابو الحسن علی بن مسلم جمال الاسلام امام صاحب کے نامور شاگردوں میں تھے حافظ ابن عساکر محدث ان کے شاگرد ہیں۔

دوسری قسم کے وہ طلبہ تھے جو امام صاحب سے علوم باطنی کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے۔

ان میں ابو الفتح نصر بن محمد آذربائیجانی اور ابو طالب عبدالکریم رازی بہت مشہور ہیں۔ موخر الذکر کو احیاء العلوم حفظ یاد تھی۔

ان کے علاوہ علامہ ابو بکر عربی جو علمائے اندلس میں شہرت عام کے مالک تھے امام صاحب ہی کے شاگرد تھے۔

امام صاحب کے ان مناقب و فضائل کا منبع و مخزن بلا مبالغہ "افضل بن محمد بن علی المعروف بہ شیخ ابو علی فارمدی کی ذات والا صفات ہے۔

نفحات الانس میں فرمایا کہ:

"انتساب وی در تصوف بہ شیخ ابا علی فارمدی است"

شیخ صاحب موصوف شیخ الشیوخ حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے نامور خلفاء میں ہیں۔ بہت عالی مرتبہ صوفی تھے۔ مدتوں حضرت ابوالقاسم گرگانی کی خدمت میں رہے اور ریاضات و مجاہدات شاقہ کے باعث شیخ کی نظروں میں کھپ گئے اور مقربانِ بارگاہ الٰہی میں شمار کئے جانے لگے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیْ اِلَیْکَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ط

العبد محمد خلیل خان القادری البرکاتی عفی عنہ
مدرسہ احسن البرکات حیدرآباد پاک
۱۷ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ

مناجات

من بخواب و پاسبان من توئی
من چو طفل و حرز جان من توئی
گر ہزاران دام باشد ہر قدم
چوں تو با مائی نباشد ہیچ غم
کار ما سہو است و نسیان و خطا
کار تو غفاری و بخشش عطا
سہو و نسیاں را مبدل کن بعلم
من ہمہ جہلم مرا دہ صبر و حلم

المنقذ من الضلال

مُصنّفہ

حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مترجمہ

خلیل العلماء مفتی محمد خلیل خاں صاحب قادری برکاتی

صدر المدرسین مدرسہ احسن البرکات حیدرآباد

پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

تمام حمد و ثنا اللہ عزوجل کی ذاتِ کریم کو زیبا جس کے نام پاک سے ہر کتاب اور ہر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے اور درود و سلام بے انتہا حضرت محمد مصطفٰے علیہ التحیتہ والثنار پہ جو نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔ اور اُن کے آل و اصحاب پہ جو گمراہیوں سے نجات دینے والے (اور راہ راست دکھانے والے) ہیں۔

امابعد: برادرِ عزیز تم مجھ سے فرمائش کرتے ہو کہ:

(۱) میں تمھیں علم کے مقاصد اور اُس کے اسرار سمجھاؤں۔

(۲) گوناگوں مذاہبِ عالم کے نشیب و فراز بتاؤں۔

(۳) اور تمھارے سامنے ان دشواریوں کو دُہراؤں جو مجھے مختلف فرقوں یا گروہوں کے جُدا جُدا راستوں اور الگ الگ راہوں سے حق کی جستجو میں پیش آئیں۔

(۴) اور ساتھ ہی تم پر یہ واضح کروں کہ میں نے کسی کی اندھی اور لایعنی تقلید و لپس روی کی پستی سے نکل کر تحقیقِ حق کی بلندی تک پہنچنے کی جراٗت کیسے کی؟

(۵) پھر یہ کہ میں نے شروع شروع میں علمِ کلام سے کیا کیا فائدے حاصل کیئے؟

(۶) اور یہ کہ میں نے اہلِ تعلیم یعنی اُن لوگوں سے جو کسی امامِ برحق کی تقلید سے قاصر (بلکہ محروم) رہے۔ کون کون سی باتیں اخذ کیں۔

(۷) اور یہ کہ میں نے فلسفیوں کے طریقۂ کار کو کیوں غلط ٹھہرایا؟

(۸) اور یہ کہ آخر کار میں نے اہلِ تصوف یعنی صوفیائے کرام کے مسلک کو کیوں پسند و اختیار کیا؟

(۹) اور یہ کہ میں نے حق کی پیہم و لگاتار جستجو کے دوران مخلوق کی گفتگوؤں سے کون کون سی گتھیوں کو سلجھایا؟

(۱۰) اور یہ کہ طلبہ کی کثرت کے باوجود میں نے بغداد میں درس و تدریس کا سلسلہ کیوں ختم کیا؟

(ii) اور یہ کہ بہت عرصہ گذرنے کے بعد پھر کس چیز کے تحت میں نیشاپور واپس آیا۔

چونکہ اس معاملہ میں تمھاری رغبت کو سچ سمجھ رہا ہوں اس لئے (کثرتِ مشاغل کے باعث) میں بعجلت تمھاری اِن فرمائشوں کو پورا کرتا (اور تمھارے اِن سوالوں کے جواب دیتا) ہوں۔ میں اللہ سے مدد طلب کرتا ہوں اُسی پر میرا بھروسہ ہے۔ اُسی سے توفیق خیر چاہتا ہوں۔ اُسی سے میری التجا ہے۔

عزیزو، اللہ عزوجل تمھیں راہِ راست پر چلائے اور حق کی فرمانبرداری کے لئے تمھیں نرم بنائے، یہ امر ذہن نشین کرلو کہ دورِ حاضر میں دین و ملت سے متعلق یہ باہمی اختلاف۔ پھر امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کی مختلف فرقوں اور علیحدہ علیحدہ راہوں کی یہ تقسیم ایک عمیق ناپایاب سمندر ہے۔ جس میں بہت سے ڈوب چکے (اور کچھ ڈوبتے چلے جارہے ہیں) اور وہ لوگ تو بہت کم ہیں جو اِن بکھیڑوں سے دور (اور اپنی نجات کے نشے میں مخمور) ہیں۔ اس پر لطف یہ کہ ہر فرقہ بزعمِ خویش اس خیالِ خام میں گرفتار ہے کہ صرف ہمارا فرقہ ناجی ہے۔ نجات پانے والے صرف ہم ہیں۔ قرآنِ کریم میں بجا ارشاد فرمایا گیا کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ؕ یعنی ہر گروہ جو اُس کے پاس ہے اُس پر خوش ہے۔

ارے غافلو، یہ وہی چیز تو ہے جس کی خبر اُس صادق مصدوق (عالم ماکان و مایکون) صلی اللہ علیہ وسلم نے دی کہ عنقریب عہ میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اُن میں ایک فرقہ جنتی ہوگا باقی سب جہنمی۔ چنانچہ جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا وہی وقوع میں آیا۔

بہرکیف میں اپنی نوجوانی سے جبکہ میں بیس سال کا بھی نہ تھا اس وقت تک جبکہ میری عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے، اسی گہرے سمندر میں غوطہ زنی کرتا رہا۔ لیکن میری یہ غوطہ زنی کسی بزدل یا نامرد کی سی نہ تھی بلکہ ہمت و جسارت والے مرد کی مانند تھی کہ میں ہر تاریکی میں گھس کر اُسے ٹٹولتا، ہر مشکل امر میں دماغ لڑاتا، ہر بھنور میں کود جاتا اور ہر فرقہ کے متعلق تفتیش کرتا، اور ہر گروہ کے مذہبی اسرار پر اطلاع و واقفیت حاصل کرتا تھا۔ تاکہ حق پسندوں کو باطل

عہ اس کے بعد حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ "صحابہ نے عرض کی۔ وہ ناجی (جنتی) فرقہ کون ہے یا رسول اللہ۔ فرمایا وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں یعنی سنت کے پیرو۔ دوسری روایت میں ہے فرمایا وہ جماعت ہے یعنی مسلمانوں کا بڑا گروہ جیسے سواد اعظم فرمایا۔ اور فرمایا جو اس سے الگ ہوا جہنم میں الگ ہوا۔ اسی وجہ سے اس ناجی فرقہ کا نام اہلسنت و جماعت ہوا۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ

یستوں سے اور اہلِ سنت کو اہلِ بدعت سے ممتاز کر سکوں
دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتے) اِس لیئے میں نے اہلِ باطن
سے کسی فرقہ کو اُس کی باطنی حقیقت معلوم کئے بغیر چھوڑا نہ اہلِ ظاہر
اُن کی واقفیت پر واقفیت بغیر رہنے دیا۔ اور بالکل اسی طرح
میں نے فلسفیوں کو اُن کے فلسفہ کی کنہ وحقیقت دریافت
کئے بغیر چھوڑا اور نہ مجھ سے متکلمین کا گروہ چھوٹا جن کے کلام اور
بحث ومباحثے کی مجھے اطلاع نہ ہوئی۔

یوں ہی، نہ کوئی صوفی ایسا رہا جس کی صوفیت پر اطلاع
پالی میں نے رغبت نہ کی نہ کوئی ایسا عبادت گذار مجھ سے رہ گیا
جس کی عبادت وریاضت کا انجام میں نے معلوم نہ کر لیا۔

بلکہ میں نے آزاد روش زندیق کا بھی پیچھا کیا تاکہ مجھے
اُس کی آزادیِ طبع اور دین وملت سے بیگانگی کے اسباب معلوم
ہوں۔

پھر اِن تمام واقعات وحقائق امور کے انکشاف کی
پیاس (اور ہر امر کی حقیقت معلوم کرنے کا یہ ذوق وشوق)
جو مجھے ابتداءِ عمر اور شروع ہی سے تھا ایک قدرتی اور
فطری (پیدائشی) امر تھا جو رب کریم جل جلالہ نے میری سرشت
میں رکھا۔ میرے ارادہ اور کسب کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔
غرض انھیں حالات نے رفتہ رفتہ مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا

جہاں تقلید کی بندش ٹوٹ گئی اور آنکھ بند کر کے پس روی اور
فرمانبرداری کا پھندا میری گردن سے نکل گیا۔ یہاں تک کہ وہ عقائد
جو میں نے وراثت میں پائے اور جو بچپن سے مجھے ذہن نشین کرائے
گئے تھے شیشے کی مانند چکنا چور ہونے لگے اور اُن کی وقعت
میرے دل سے جاتی رہی۔

بات یہ ہوئی کہ جب میں نے دیکھا کہ عیسائی بچوں کا نشو
ونما عیسائیت پر ہو رہا ہے، اور یہودی بچوں کی پرورش اُنکے
مذہب کے مطابق ہو رہی ہے اور مسلمان بچوں کو اسلامی اصول
کے ماتحت تربیت دی جا رہی ہے تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آئی جو میں نے سنی تھی کہ ہر بچہ
فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اُس کے ماں باپ (اُسے
تعلیم و تربیت کے ذریعہ) خواہ یہودی بنائیں یا نصرانی بنائیں
یا مجوسی بنائیں۔" اب میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں
انسان کی فطری حقیقت یعنی پیدائشی حالت اور اُن عقائد
کی واقعی حالت معلوم کروں جو والدین یا اساتذہ کی تربیت
و تعلیم سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اُن تقلیدی اور
تلقینی امور کو ایک دوسرے سے ممتاز کروں جن کے باعث
حق اور باطل کی تمیز و شناخت میں یہ اختلافات پڑے ہوئے
ہیں۔ اور میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میرا مقصود

"حقائق آموز" کے علم سے حاصل ہوگا (جس میں ہر چیز کی حقیقت وماہیت پر بحث کی جاتی ہے) لہٰذا پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ولازم ہے کہ علم کی ماہیت وحقیقت کیا ہے۔

اور یہ بات مجھے جلد ہی معلوم ہو گئی کہ علم یقینی وہ نور ہے جس میں ہر شے اس طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ اُس میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ اور وہم وگمان کا امکان بھی اُس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ بلکہ اس وہم وغلط کے فرض کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ بلکہ غلطی وخطا سے مامون و محفوظ رہنا یقین کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو کہ اگر کوئی ایسا شخص جو پتھر کو سونا اور لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھاتا ہو اس کے برخلاف کوئی دعوےٰ کرے اور اُس کا باطل ہونا ثابت کرے تو بھی انسان کے دل میں کسی شک یا انکار کی جگہ باقی نہ رہے۔ مثلاً جب مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد "تین" سے زیادہ ہے اور کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "نہیں بلکہ تین کا عدد دس سے زیادہ ہے اور میرے پاس اس پر یہ دلیل قوی ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں" اور وہ میری آنکھوں کے سامنے یہ کر بھی دے تو بھی اس کے سبب سے میری اُس معرفت اور یقین میں شک نہیں آسکتا۔ اور مجھے اس کی اس حرکت سے سوائے اس تعجب کے کوئی اور چیز حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ اس قدر

طاقت و قوت کا مالک ہے اور یہ کہ اُسے یہ قدرت کس طرح حاصل ہوئی۔

الحاصل، میں نے یہ سمجھ لیا کہ جب تک مجھے کسی چیز پر اسی طرح کا وثوق اور یقین حاصل نہ ہوگا میں نہ اُس علم پر بھروسہ کروں گا اور نہ اس کا کچھ اعتبار۔ اور ہر وہ علم جو قابلِ اعتماد اور شک و شبہ سے مامون نہ ہو وہ علم یقینی نہیں ہوسکتا۔

پہلا مقالہ

اس کے بعد میں نے اپنے علوم کو ٹٹولنا شروع کیا۔ کہ اس قسم کا یقینی علم مجھے کس حد تک ہے۔ تو میں نے اپنے نفس کو حسّیات اور ضروریات کے علاوہ باقی تمام علوم یقینیہ سے محض بے بہرہ پایا تو میں نے دل میں کہا کہ اس حالتِ یاس و ناامیدی میں میری دشواریاں انھیں روشن و جلی چیزوں یعنی حسیات اور ضروریات سے حل ہوں گی تو پہلے انھیں کا استحکام ضروری ہے۔ تاکہ میں یہ بھی تو معلوم کر لوں کہ ان محسوسات پر میرا اعتماد اور ضروریات پر میرا اعتبار اور اپنے آپ کو خطا سے مامون سمجھنا کیا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس سے پیشتر مجھے تقلیدی امور میں حاصل تھا یا جیسا کہ عام مخلوق کو ضروریات پر ہوتا ہے۔ یا ایسا جیسا کہ محقق کو حاصل ہوتا ہے جس میں نہ شک کا شائبہ ہوتا ہے نہ وہم کا دغدغہ۔ اس لئے میں ان محسوسات و ضروریات

میں کوشش بلیغ سے غور و تامل کرنے اور یہ دیکھنے لگا کہ میرے نفس کو ان میں کسی شک و شبہ کا امکان تو باقی نہیں رہتا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ جب کد و کاوش بڑھی تو میرے شکوک بھی ان میں بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ محسوسات میں بھی میرا دل مطمئن نہ رہا کہ ان میں یہ تسلیم کرلوں کہ یہ مامون و محفوظ ہیں۔ بلکہ میرے دل میں یہ شبہے آتے اور بڑھتے ہی رہے کہ ان محسوسات پر بھی کیا اعتماد و یقین۔ دیکھو، سب سے زیادہ قوی حاسّہ نظر و بصارت کا حاسّہ ہے۔ لیکن اس کا بھی عالم یہ ہے کہ وہ کسی چیز کے سایے کو دیکھتی، اُسے ساکن و غیر متحرک خیال کرتی بلکہ اُس سے حرکت کی نفی کا یقینی حکم لگاتی ہے۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں تجربہ اور مشاہدہ سے وہ اس امر پر یقین کرلیتی ہے کہ سایہ حرکت کر رہا ہے۔ لیکن اچانک اور دفعۃً نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً۔ یہاں تک کہ وہ سایہ کسی وقت ساکن ہوا ہی نہ تھا۔

اسی طرح نگاہیں ستاروں کو دیکھتی اور گمان کرتی ہیں کہ یہ چھوٹے چھوٹے تارے دینار کے برابر ہیں۔ لیکن علم ہندسہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنی جسامت میں زمین سے بڑے ہیں۔

غرض یہ اور ان کے علاوہ اور محسوسات ایسے ہیں جن کی نسبت ہماری قوتِ حاسّہ ایک حکم لگاتی ہے، لیکن عقل

اُس کی تکذیب کچھ اس طرح کر دیتا ہے کہ حاسّہ کا حکم عقل کے حکم کے سامنے بے حقیقت رہ جاتا ہے۔

اب میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ جب ایسے محسوسات پر بھی یقین نہیں کیا جاسکتا تو شاید وہ امورِ عقلیہ ہی قابلِ اعتماد ہوں جن کو اولیات کہا جاتا ہے۔

مثلاً ہم کہتے ہیں کہ دس تین سے زیادہ ہیں یا نفی واثبات باہم جمع نہیں ہوسکتے۔ یا جو حادث ہے وہ قدیم نہیں ہوسکتا۔ یا جو موجود ہے وہ معدوم نہیں۔ یا جو واجب ہے محال نہیں ہوسکتا۔ لیکن محسوسات نے بزبانِ حال کہا کہ تمھیں ان عقلیات پر تو وہ اعتماد بھی حاصل نہیں ہوسکتا جو محسوسات پر تھا۔ پہلے تمھیں ہم محسوسات پر یقین تھا۔ لیکن حاکمِ عقل نے جب اُن کو جھٹلا دیا تو تم ہمیں چھوڑ بیٹھے۔ اور اگر عقل یہ حکم نہ لگاتی تو تم ہماری تصدیق ہی کرتے رہتے۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ عقل سے بالا و برتر کوئی اور حاکم ہو کہ جب وہ تجلی فرمائے تو عقل اپنے حکم میں کاذب ٹھہرے۔ جیسے کہ عقل نے جب اپنا جلوہ دکھایا تو حِس اسے حکم میں کاذب ٹھہری۔ اور عقل سے ماورار ادراک کا اس وقت جلوہ نہ دکھانا اس چیز پہ دلیل نہیں ہوسکتی کہ اس کا وجود ہی محال ہے اور وہ درحقیقت ہے بھی نہیں!!

یہ سن کر میرا نفس اس کے جواب میں متامّل ہوا۔ بلکہ
حالتِ خواب نے اس اعتراض کو اور مؤکد بنا دیا۔ اور دل
نے کہا کہ کیا خواب میں تم وہ چیزیں نہیں دیکھتے اور تمھارے خیال
میں وہ چیزیں نہیں آتیں جن پر تم پورا پورا اعتماد کر لیتے ہو اور
اس حالتِ خواب میں تمھیں ان کے ثبات و قرار میں کوئی شک
نہیں رہتا۔ لیکن جب تم بیدار ہوتے اور اپنی آنکھ کھولتے ہو
تو تمھیں واضح طور پر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ تمھارے
وہ خیالات اور معتقدات محض بے اصل اور بے بنیاد تھے
بالکل اسی طرح تم نے اس پر کیسے یقین کر لیا کہ تمام وہ معقولات
اور محسوسات جن پر تم عالمِ بیداری میں یقین کامل رکھتے ہو
وہ واقعی تمھاری حالت کے اعتبار سے حق اور واقع کے
مطابق ہوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ تم پر کوئی ایسی حالت طاری
ہو جائے جس کو تمھاری حالتِ بیداری سے وہی نسبت ہو
جو تمھاری حالتِ بیداری کو حالتِ خواب سے تھی اور
اس اعتبار سے تمھاری بیداری کی حالت، نیند اور خواب کی
حالت کے مانند ہو جائے۔ اور جب تم پر یہ حالت وارد
ہو گی تو تمھیں اس پر یقین آ جائے گا کہ وہ تمام امور جو تمھاری
عقل میں بطور وہم سما گئے تھے وہ محض وہ خیالات تھے
جن کا کوئی حاصل نہیں اور ان پر کوئی ثمرہ مترتب نہیں ہوتا۔ اور

عجب نہیں کہ یہ حالت وہی حالت ہو جس کا صوفیائے کرام دعوے کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے باطن میں مستغرق اور محو ہو جاتے اور اپنی خودی سے نکل جاتے ہیں تو اس عالم بے خودی و حالتِ وارفتگی میں وہ کچھ ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ان معقولات کے برعکس ہوتے ہیں۔

اور ہو سکتا ہے کہ یہ حالت خود انسان کی موت ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "لوگ سو رہے جب مر جائیں گے تو جاگیں گے" تو شاید یہ دنیاوی زندگی، اُخروی زندگی کے اعتبار سے خواب و خیال ہی ہو کہ جب انسان پر موت طاری ہو گی تو اُس پر اُس عالمِ آخرت میں تمام چیزیں اُس کے دنیاوی مشاہدہ کے خلاف ظاہر و ثابت ہوں گی۔ اور اُس وقت اُس سے فرمایا جائے گا کہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ○ (یعنی ہم نے تجھ پر سے وہ پردہ اُٹھا دیا جو تیرے دل اور کانوں اور آنکھوں پر پڑا تھا۔ تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔)

اور جب اس قسم کے اندیشے میرے دل میں گذرے تو میں اپنے دل ہی دل میں بہت کڑھا اور میں نے ان اندیشوں کا علاج چاہا لیکن کچھ بن نہ پڑا۔ اور در اصل اس کی وجہ یہ تھی

کہ ان کا دفعیہ بلا دلیل ممکن نہ تھا۔ اور کسی امر پہ دلیل قائم کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک علومِ اولیات سے اُس کو مرکب نہ کیا جائے اور ان علوم پر وہ اعتماد و اعتبار نہ رہا۔ تو یہ دوا بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور تقریباً دو ماہ تک میں اسی عالم سشش و پنچ میں رہا۔ اور میری ظاہری حالت سوفسطائیوں کی طرح ہو گئی جو بدیہی چیزوں کے منکر ہیں۔ لیکن میں نہ کچھ کہتا تھا نہ کسی سے بولتا تھا۔

یہاں تک کہ رحمتِ خداوندی نے میری دستگیری فرما کر مجھے اس حالتِ ممرض سے شفا بخشی اور حالت اعتدال پر آگئی۔ اور وہ ضروریاتِ عقلیہ مجھے پھر قابلِ قبول و لائق وثوق ماننے پڑے کہ یقیناً یہ خطا سے مامون و محفوظ ہیں۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ ان ضروریات پر میرا یقین و وثوق کسی دلیل کی ترتیب و ترکیب کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ درحقیقت یہ ثمرہ تھا اُس نورِ ربانی کا جو اللہ عزوجل نے میرے دل میں القا فرمایا۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہی نور تمام امور معرفت کے کشف کی کنجی ہے۔ اور جس کا یہ گمان ہے کہ کشفِ حقیقت صرف دلائل پر موقوف ہے وہ اپنے لئے اللہ تعالےٰ کے وسیع دائرہ رحمت کو تنگ کر رہا ہے۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک

وسلم سے جب آیۂ کریمہ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے) اور آیۂ مذکورہ میں واقع لفظ شرح کے معنی پوچھے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ ایک نور ہے جسے اللہ تعالےٰ دل میں ڈال دیتا ہے"۔ عرض کیا گیا "اس کی علامت کیا ہے؟" فرمایا "یہ کہ آدمی اس مکر و فریب کی دنیا سے دُور و نفور اور اُس دار پائدار یعنی عاقبت کے لئے مستعد و مخمور رہے۔" اور یہی منشار و مقصود ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اس قولِ مبارک کا کہ "رب عزوجل نے تمام مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر اُن پر اپنی نورانی تجلی تجلی ڈالی۔

غرض یہ کہ کشفِ حقیقت اسی نور سے طلب کرنا چاہیئے اور چونکہ یہ نور محض فیضانِ الٰہی سے میسر آتا اور دلوں کو جگمگاتا ہے۔ اس لئے اسی کے درپے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ارشاد فرماتے ہیں کہ "تمھاری اس زندگی کے دوران میں اللہ عزوجل کی خاص لپٹیں (خوشگوار ہوائیں) ہیں (جو تم پر گزرتی ہیں) دیکھو تم اُن کی جستجو اور تلاش میں رہنا۔" مطلب یہ کہ انسان کو اُس کی طلب میں ہمیشہ سرگرم عمل اور جد و جہد میں مشغول رہنا چاہیئے۔ تاکہ اس کی رسائی ان امور تک

ہو جائے جس تک عقل رسا نہیں۔ اس لئے کہ مقصود ان اولیات کا حصول نہیں کہ وہ تو خود حاضر ہیں۔ اور جب حاضر کی جستجو و طلب کی جاتی ہے تو وہ مفقود و معدوم ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص اُس کی طلب کرتا ہے جس تک عقل کی رسائی نہیں تو اُس پر یہ الزام قائم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسی چیز کی طلب میں قاصر ہے جو طلب کی جا سکتی ہے۔ (یعنی مقصود اعلیٰ کی طرف رغبت و سعی کرنے والوں پر اس سے ادنیٰ مراتب و مقاصد خود بخود واضح ہو جاتے ہیں تو اُن پر کوئی طعن نہیں)۔

دوسرا مقالہ

طالبانِ حق کی تقسیم

اللہ عزوجل نے جب محض اپنے فضل و بے پایاں کرم سے مجھے اس مرض سے شفا عطا فرمائی تو میں نے طالبانِ حق و مدعیانِ حق کو چار فرقوں میں منقسم پایا۔

(۱) متکلمین، جن کا دعوےٰ ہے کہ ہم اہلِ نظر اور صاحب رائے ہیں۔

(۲) باطنیہ، جن کا گمان فاسد یہ ہے کہ ہم اہل علم ہیں یا اور امام معصوم سے فیضان کی تحصیل ہم سے مخصوص ہے۔

(۳) فلاسفہ، جو بزعم خویش خود کو منطق و برہان کا اہل سمجھتے ہیں یا۔

(۴) صوفیہ صافیہ، جو فرماتے ہیں کہ ہم خاصانِ درگاہ الٰہی

اور اہلِ کشف و مشاہدہ ہیں۔

اب میں نے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ حق اِن چاروں فرقوں سے متجاوز نہیں۔ اِن میں کوئی ایک ضرور حق پر ہے۔ کیونکہ یہی چاروں گروہ تلاشِ حق کے راستوں پر گامزن ہیں۔ اگر اِن میں سے بھی کوئی حق پر نہیں تو پھر وصولِ حق کی امید فضول ہے۔ جیسے کسی کی پس روی سے منھ موڑ لینے کے بعد پھر اُس کی پیروی میں کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ اِس لئے کہ کسی کا پیرو اُسی وقت تک پیرو رہتا ہے جب تک اُسے اپنی پس روی و تقلید کا علم نہیں ہوتا۔ اور جب وہ اُس پر واقف ہو جاتا ہے تو اُس کی تقلید کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اور اُس میں ایسا شگاف اور بال پیدا ہو جاتا ہے جسے ملانے اور چپکانے سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ جبتک اُسے آگ میں ڈال کر پگھلا یا اور نئے شیشے کے ڈھانچہ میں نہ ڈھالا جائے۔ اب میں نے ان فرقوں کے راستوں پر چلنے اور ان چیزوں کی تحصیل کا ارادہ کیا جو ان فرقوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ پہلے علمِ کلام کو دیکھوں۔ اس کے بعد فلسفہ کو ٹٹولوں۔ پھر باطنیہ کی راہ و رسم کو پرکھوں اور سب سے آخر میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کا مطالعہ کروں۔

تیسرا مقالہ

علم کلام کا مقصود و حاصل

اب میں نے سب سے پہلے علم کلام کو لیا۔ پڑھا سمجھا۔ اور علم کلام کے محققین کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ لیکن میں نے اس علم کو یہ سمجھا کہ یہ اپنے مقصود کو تو پورا کر سکتا ہے۔ مگر میرا مقصد اس سے حسب منشار حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس سے میری تسلی ہو سکتی ہے۔ اس علم کا مقصود اہل سنت [1] و جماعت کے عقائد کی اہل بدعت کی کتر بونت

---

[1] محاورۂ قرآن و حدیث میں مومن و مسلم خاص اہلسنت کو کہتے ہیں کہ زمانۂ نزول قرآن مجید و ارشاد احادیث کریمہ میں صرف اہل حق اہل سنت اہل جماعت ہی تھے۔ اس زمانِ برکت نشان میں کسی بدمذہب مبتدع کا ہونا محال تھا کہ بدمذہبی شبہہ و تاویل سے پیدا ہوتی ہے (بقیہ صفحہ ۵۲)

سے حفاظت کرتا ہے۔ اس لئے کہ رب العزۃ جل جلالہٗ نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اپنے بندوں کے دلوں میں وہ عقیدے راسخ فرما دیئے جن میں اُن کے دین کا بھی بھلا تھا اور دنیا کا بھی۔ اور میرے اس دعوے پر قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ گواہ ہیں۔ لیکن اُس دُزدِ رجیم یعنی ابلیس لعین نے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر وہ چیزیں لا کھڑی کر دیں جو سنت سے ٹکراتی تھیں اور پھر یہی لوگ اِن عقائدِ باطلہ پر ایسے اڑ گئے کہ اہلِ حق کو اپنے عقائدِ حقہ پر قائم رہنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ ایسے آڑے وقت میں اللہ عزوجل نے گروہِ متکلمین کو پیدا فرمایا۔ اور اُن کے دلوں میں سنت کی نصرت کا جذبہ و شوق ڈالا کہ وہ اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱) جسے یقین قطعی سے بدلنے والے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جلوہ فرما تھے۔ اگر شبہ گزرتا تو حضورؐ کشف فرماتے۔ شبہ والا مانتا تو سُنّی ہوتا، نہ مانتا تو کافر ہو جاتا۔ یہ بیچ کی شق وہاں ممکن ہی نہ تھی۔

یہ فائدہ نفیسہ یاد رکھنے کا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ وغیرہا آیات واحادیث میں مومنین سے اہلِ سنت ہی مراد ہیں اُنہیں کے باہم اتفاق و اتحاد کا حکم ہے۔ تمام گمراہوں بدمذہبوں سے اتحاد و وِداد کی تعلیم اور جملہ مبتدعین و منکرین کی تکریم و تعظیم پر اِن نصوص کو پیش کرنا محض بددینی و ضلالت ہے والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ (اہلاک الوہابیین) مترجم۔

ترتیب وار کلام سے اہلِ بدعت کی ان بد مذہبیوں کا قلع قمع کر دیں
جو اس نوپید اگروہ نے سنتِ متوارثہ کے خلاف پھیلا رکھے ہیں
اور یہی منشاء و ماخذ ہے علم کلام اور متکلمین کا۔ انھیں متکلمین میں سے
ایک گروہ نے بفضلہٖ تبارک و تعالیٰ اہلسنت پر وارد کیے جانے
والے تمام اعتراضات کو دفع فرمایا اور بارگاہِ نبوت سے
حاصل کیے ہوئے عقائد پر تیر اندازوں کی یورش کا ڈٹ کر مقابلہ
کیا۔ اور اہلِ بدعت عہ نے اُن میں جو اپنی بدعتوں سے رختنے

عہ بدعت یعنی نوپیدا باتیں دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ کہ
قرآن یا احادیث یا آثار یا اجماع کے خلاف نکالی جائیں۔ دوسرے
وہ اچھی باتیں کہ عوام و خواص میں رواج پائیں۔ یعنی اگر بدعت کسی ایسی
چیز کے نیچے داخل ہو جس کی خوبی شرع سے ثابت ہے تو وہ اچھی ہے
اور اسی بدعت کو بدعتِ حسنہ یا بدعتِ محمودہ کہا جاتا ہے اور یہ بدعت
کبھی مباح کبھی مستحب کبھی سنت بلکہ واجب تک ہوتی ہے۔ حضرت
امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تراویح کی نسبت فرماتے
ہیں نِعْمَتِ الْبِدْعَۃُ ھٰذِہٖ یہ اچھی بدعت ہے۔ حالانکہ تراویح
سنتِ مؤکدہ ہے۔ اور اگر بدعت کسی ایسی چیز کے تحت داخل ہو
جس کی برائی شرع سے ثابت ہے یعنی وہ کسی سنتِ ماموربہا کا
رد کرتی ہے تو وہ بدعت سیئہ یا مذمومہ ہے۔ اور کبھی مکروہ و ممنوع ہوتی

ڈال دیئے تھے اُنھیں دُور کیا۔ لیکن متکلمین نے اس بارہ میں اُن مقدمات و دلائل پر اعتماد و اعتبار کیا جو اُن کے مخالفوں کے نزدیک بھی مسلم اور قابلِ قبول تھے۔ اور جن کی بنا تقلید پر تھی یا اجماعِ امت پر۔ یا وہ امور خود اُنھوں نے قرآن و حدیث سے اخذ اور تسلیم کر لئے تھے۔ ان حضرات کی زیادہ تر سعی اس امر میں صرف ہوتی کہ وہ مخالفین کے مقابل اُنھیں کے تسلیم کردہ اُصول سے نقض وارد کریں اور اُن پر مواخذہ جاری رکھیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ کار اُس شخص کے مقابل زیادہ مفید نہیں ہو سکتا جو سوائے ضروریات و بدیہیات کے کسی چیز کو تسلیم نہ کرے۔ اس لئے میرے حق میں یہ علم کلام ہر اعتبار سے کافی نہ تھا اور نہ میرے اُس مرض کیلئے شافی تھا جس کا مجھے عارضہ تھا۔ بلکہ ایک بات یہ ہوئی کہ جب علم کلام پھیلا اور لوگ اس کے مباحث میں دلچسپی لینے لگے اور اہلِ سنت سے اعتراضات کے دفعیہ میں حقائق امور کی بحثیں اور جواہر و اعراض اور اُن سے متعلق احکام پر زور آزمائیاں ہونے لگیں حالانکہ یہ اُن کے علم کی غرض و غایت نہ تھی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ علم بامِ ترقی تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) ہے کبھی حرام دونا جائز۔ اور جب بدعت مطلق بولتے ہیں تو اس سے اس معنی ددم کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ مترجم عفی عنہ

نہ پہنچ سکا اور اُس سے وہ مقصود فوت ہو گیا کہ مخلوق کو ان اختلافات اور باہمی نزاع و حیرت کی تاریکیوں سے نجات حاصل ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے اس سے حسب منشاء فائدہ اُٹھایا ہو۔ بلکہ شک کیسا اس پر تو یقین ہے کہ بکثرت بندگانِ خدا کو اس سے فائدہ پہنچا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان فائدوں کا حصول بعض امور میں جو اولیات و بدیہیات سے نہیں ہیں تقلید کی آمیزش سے خالی نہ رہا۔ اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں صرف اپنی حالت کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ میں اُن لوگوں پر انکار کی کوئی وجہ نہیں پاتا جنھیں اس سے شفا حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ جیسا مرض ہوتا ہے ویسی ہی اس کی دوا۔ مرض بدلتا ہے تو دوا بھی بدل جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایک ہی دوا ایک مریض کو فائدہ پہنچاتی ہے لیکن وہی دوا اُس جیسے دوسرے مریض کے حق میں مہلک و مضر ثابت ہوتی ہے۔

چوتھا مقالہ

فلسفہ و فلاسفہ

اس میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں۔
(۱) کون سا فلسفہ مذمت کے قابل ہے؟
(۲) کون سا فلسفہ غیر مذموم ہے؟
(۳) وہ امور جن کا معتقد کافر ہے۔
(۴) وہ امور جن کا اعتقاد کفر نہیں۔
(۵) وہ چیزیں جن کا قائل بد مذہب عہ ہے۔
(۶) وہ چیزیں جن کا قائل بد مذہب نہیں۔

عہ مسائل تین قسم کے ہوتے ہیں۔
(۱) ضروریاتِ دین۔ ان کا منکر بلکہ ان میں ادنیٰ شک کرنے والا (باقی صفحہ ۵۷ پر)

(۷) وہ کون کون سی باتیں ہیں جو فلسفیوں نے اہلِ حق کے کلام سے چرا کر اپنے کلام میں داخل کر لیں تاکہ اس خلط مبحث سے وہ اپنے باطل کو رواج دے سکیں۔

(۸) یہ کہ لوگوں میں ان سے نفرت کیوں پیدا ہوئی؟

(۹) یہ کہ حق و باطل کو پرکھنے والا اس سے کس طرح نجات پا سکتا۔ اور

(۱۰) ان کے کلام میں کھرے کھوٹے کو کیونکر جانچ سکتا ہے؟

علم کلام سے فراغت کے بعد میں نے علم فلسفہ کی طرف اقدام کیا۔ اور یہ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ کسی علم کے فساد پر آدمی کو اُس وقت تک اطلاع نہیں ہو سکتی جب تک اس علم کو پورے طور پر حاصل نہ کر لیا جائے، یہاں تک کہ اپنی معلومات کی بنا پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) بالیقین کافر ہوتا ہے۔ ایسا کہ جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر۔

(۲) ضروریات عقائد اہلِ سنت۔ ان کا منکر بد مذہب گمراہ ہوتا ہے۔

(۳) وہ مسائل کہ علماء اہلسنت میں مختلف فیہ ہوں ان میں مثبت و نافی کسی پر معاذ اللہ کفر و ضلال کیا معنی فسق کا بھی حکم نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اپنے خیال میں کسی قول کو راجح جانے خواہ تحقیقاً یعنی دلیل سے اُسے وہی مرجح نظر آیا خواہ تقلیداً کہ اُسے اپنے نزدیک (دوسرے صفحہ پر)

اُس علم کے اعلیٰ درجے کے علما سے ہمسری کا درجہ حاصل نہ کرے بلکہ یہاں تک کمال پیدا کرے کہ اُن سے اعلیٰ مقام تک پہنچ کر اُس علم کے نشیب و فراز پر کامل واقفیت حاصل کرے، تاکہ اُس علم پر اُس کی نکتہ چینیاں قابلِ اعتماد ہوں۔

لیکن اتفاقِ وقت کہ علمائے اسلام میں مجھے کوئی ایسا نظر نہ آیا جس نے اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف کی ہو، اور کمر ہمت چست باندھی ہو۔ اور متکلمین نے اپنی کتابوں میں جو کہیں کہیں اُن کے مسائل اس لئے نقل کئے کہ ان پر رَد کریں وہ کچھ ایسے پیچیدہ بلکہ باہم صریح متناقض اور ظاہر البطلان تھے جن سے کوئی ناواقف سے ناواقف بھی دھوکا نہیں کھا سکتا، نہ کہ ارباب علم واصحابِ تحقیق۔

غرض یہ میں نے سمجھ لیا کہ ان بدمذہبوں کے دینِ باطل کی تحقیق کئے بغیر ان کی تردید، اندھیرے میں تیر چلانے سے کم نہیں اور اسی لئے میں نے اس علم کی تحصیل میں آستین چڑھا کر جدوجہد شروع کر دی۔ اور یہ کام میں نے کسی استاد کے بغیر محض ان کی کتابوں کے مطالعہ پر موقوف رکھا۔ اور درس و تدریس اور علوم شرعیہ میں تصنیف سے جو وقت بچ رہتا میں اس میں

(حاشیہ صفحہ ۵۷) اکثر علما رہا اپنے متحد علیہم کا قول پایا ۱۲ (خالص الاعتقاد) مترجم عفی عنہ

صرف کر دیتا۔ حالانکہ اس وقت میرے پاس تقریباً تین سو طلبہ کی تعداد موجود تھی اور میں بغداد[ع] کے ایک مدرسہ میں انھیں کی تعلیم پر مامور تھا۔

ع امام صاحب کی علمی شہرت دُور دور تک پہنچ چکی تھی اس لئے جب آپ نے درسگاہ سے نکل کر نظام الملک کے دربار کا رُخ کیا تو نظام الملک نے نہایت تعظیم وتکریم سے ان کا استقبال کیا اور مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا امام صاحب کی عمر اس وقت ۳۴ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں نظامیہ کی افسری حاصل کرنا ایک ایسا فخر تھا جو امام صاحب کے سوا کسی کو کبھی حاصل نہ ہوا۔

نظامیہ کی تعمیر وغیرہ پر دو لاکھ دینار صرف ہوئے اور سالانہ خرچ پندرہ ہزار دینار تھا۔ اس کی مدرسی کا منصب ایسا عظیم الشان رتبہ تھا کہ بڑے بڑے اہلِ کمال نے اس کی آرزو میں عمریں صرف کر دیں اور یہ حسرت دل کی دل میں ہی لے گئے۔

غرض امام صاحب جمادی الاولیٰ ۴۸۴ھ میں بڑی عظمت وشان وجاہ وحشم سے بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ کی مسند درس کو زینت دی۔

ان کے جاہ وجلال نے وزراء وامرا کو بھی دبا لیا۔ یہانتک کہ سلطنت کے اہم اور مہتم بالشان معاملات انکی شرکت کے بغیر انجام نہیں پاسکتے تھے (الغزالی) مترجم

اللہ تبارک و تعالیٰ کا کرم دیکھئے کہ اُس نے میری اِس مصروفیت کے باوجود دو سال سے کم عرصہ میں صرف مطالعۂ کتب کے ذریعہ اس علمِ فلسفہ کے انتہائی منازل تک مجھے پہنچا دیا۔ اور مجھے اس علم پر عبور عطا فرمایا۔ لیکن اس کے باوجود میں ایک سال تک اور اس علم کو پرکھتا سمجھتا اور اس کے مفاسد ونقائص کو ٹٹولتا رہا۔ یہاں تک کہ بکرمہٖ تعالیٰ مجھے اس علم کے تمام داؤ پیچ، مکر و فریب اور تحقیقی و تخیلی باتوں کا پتہ چل گیا۔ اور مجھے اس علم کے مفاسد میں کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

لہٰذا، اب آپ اس علم اور اس کے نتائج کے متعلق بغور سنئے کہ ان فلاسفہ میں کئی قسم کے آدمی ہیں اور ان کے علوم بھی مختلف اقسام کے ہیں۔ لیکن اس کثرت و فراوانی کے باوجود کفر و الحاد کے داغوں سے ملوث ہیں۔ البتہ اتنا ہے کہ ان کے متقدمین و متاخرین اور اگلے پچھلوں میں حق سے دوری یا نزدیکی میں بڑا عظیم فرق ہے۔

فصل (۱) فلاسفہ کے اقسام اور انکے کفریات

واضح رہے کہ فلاسفہ اپنے کثیر فرقوں اور مختلف مذہبوں کے باوجود صرف تین قسم پر منقسم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) دہریہ۔ (۲) طبعیہ۔ (۳) الٰہیہ۔

دہریہ۔ یہ متقدمین فلاسفہ کا ایک گروہ ہے جو اس خالقِ حقیقی و مدبرِ عالم اور قادرِ مطلق کا منکر ہے۔ اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ یہ عالم بذاتِ خود اسی طرح موجود ہے۔ حیوان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے اور نطفہ حیوان سے۔ اور یہ نظام اسی طور پہ قائم ہے۔ اسی طور پہ قائم رہے گا۔ یہ عقیدہ رکھنے والے تو ظاہر ہے کہ کھلّم کھلّا زندیق ہیں۔

طبعیہ۔ ان میں دوسرا گروہ طبعیّہ کا ہے۔ یہ لوگ طبعیات سے بحث کرتے ہیں اور نباتات کے عجائب و غرائب کی تحقیقات میں لگے رہتے اور حیوانات سے متعلق علم تشریح الابدان میں دماغ لڑاتے ہیں۔ جس سے اُنھیں اس خلاقِ عالم کی بکثرتِ کثیرہ وہ عجیب و غریب صنعتیں نظر پڑیں جن کے باعث وہ اس پر مجبور ہوئے کہ وہ ایک ایسی قادر و حکیم ہستی کا اعتراف کریں جسے ہر چیز کی غایت و حکمت پہ کامل اطلاع و واقفیت ہے۔

اور بات ہے بھی یہ کہ جو شخص علم تشریح الاعضاء و منافع الابدان کا مطالعہ کرے گا اُسے اس پہ ایمان لانا ہی پڑے گا کہ تمام حیوانات بالخصوص انسان کی یہ ترکیبی و تخلیقی بنیاد کسی ایسے زبردست ہاتھ نے ڈالی ہے جو بڑی تدبیر والا اور زبردست مدبر و حکیم ہے۔

لیکن اس کا کیا علاج، کہ طبعیات میں کثرتِ غور و فکر نے انھیں یہ بات بھی سجھائی کہ قوائے انسانی کے قوام میں اعتدالِ مزاج کو بڑا دخل ہے۔ اور اس سے ان لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کی قوتِ نظریہ بھی اسی اعتدالِ مزاج کے تابع ہے کہ جب مزاج باقی نہیں رہتا یہ قوت بھی جاتی رہتی ہے بلکہ معدوم ہو جاتی ہے اور معدوم کا اعادہ ممکن نہیں۔ اور یہ بھی اُن کا گمان ہے۔

بہر حال وہ اِس بات پر اڑ گئے کہ نفس بھی جب مر جائے گا اُس کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ اور اسی ضمن میں یہ لوگ آخرت کے منکر ہو گئے۔ اور جنت دوزخ حشر نشر حساب کتاب وغیرہا امورِ آخرت کا انکار کر بیٹھے۔ یعنی اُن کے نزدیک نہ طاعت پر کوئی ثواب ہے نہ معصیت پر کوئی عذاب۔ اور اس قول نے اُنھیں شترِ بے مہار بنا دیا اور وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی میں اس طرح منہمک و مصروف ہوئے جیسے چوپائے۔

مختصر یہ کہ آخر الامر یہ بھی زندیقوں میں ٹھہرے اس لئے کہ اصل ایمان تو اللہ عز و جل اور آخرت پر ایمان لانا ہے۔ اور یہ لوگ اگرچہ اللہ عز و جل کی ذات پر ایمان لانے کا ادعا کرتے ہیں۔ لیکن آخرت کے منکر ہیں تو یہ دعوے بھی

محض دعوے ہے جو ہرگز مسموع نہیں ہو سکتا۔

الٰہیہ۔ اب نہ رہا مگر ان فلسفیوں کا تیسرا گروہ۔ تو یہ لوگ ان کے متاخرین میں معدود ہیں۔ ان میں سقراط یعنی افلاطون کا استاد، افلاطون یعنی ارسطاطالیس کا استاد اور یہی ارسطاطالیس (جسے ارسطو کہا جاتا ہے) زیادہ مشہور ہیں۔ اور مؤخر الذکر یعنی ارسطو نے علم منطق کی تدوین کی۔ اور باقی علوم کو حشو و زوائد سے پاک صاف کیا۔ اور ان فلسفیوں کیلئے ایسا مسالہ تیار کر دیا جو اس سے پہلے انھیں دستیاب نہ تھا۔ بلکہ جن علوم و مسائل کی کوئی وقعت نہ تھی اُنھیں قابلِ قدر بنا دیا۔ اور اُن کی تیرہ و تنگ گلیوں کو کشادہ راہوں میں تبدیل کر دیا۔

اسی آخری گروہ نے پہلے دونوں فرقوں یعنی دہریہ اور طبعیہ پر کافی رد کیا۔ اور اُن کے فاسد خیالات و مہملات پر

عـہ۔ جزا و سزا کے لئے ایک مستقل آیندہ عالم پر یقین رکھنا دین و ایمان کے لوازم سے ہے۔ ایمان باللہ بھی اسی وقت قابلِ اعتبار و لائقِ وثوق ہے جب آدمی یہ عقیدہ بھی رکھے کہ ایک عالم آخرت بھی ہے جہاں ایک روز جزا اپنے اعمال کا سامنا کرنا اور زندگی کے ایک ایک معاملہ کا حساب دینا ہے۔ اور جزا و سزا کو اسی دنیا میں سمجھنا خواہ قومی و اجتماعی (باقی صفحہ ۶۴ پر)

اس قدر لعن طعن کیا کہ دوسروں کو مستغنی کر دیا۔ وَکَفَی اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ۔

بلکہ ارسطو نے اپنے سے پہلوں یعنی افلاطون و سقراط اور ان دونوں عـــہ کے پیش رو ماہرین الٰہیات کی بلا رو و رعایت شدید تردید کی بلکہ ان کے مہملات سے اپنی برارت ظاہر کی۔

لیکن اس کے باوجود ان کے عقائد کفریہ اور رذائل بدعیہ کی تردید اس سے رہ گئی جس کی توفیق اُسے بارگاہِ الٰہی سے نصیب نہ ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ ان فلسفیوں اور ان کے اتباع کرنے والوں جیسے ابن سینا عـــہ اور فارابی (جنھیں دعویٰ اسلام بھی تھا)

(حاشیہ صفحہ ۶۳) عروج و زوال سے خواہ بقاعدۂ تناسخ مختلف قالبوں میں روح کے اُلٹ پھیر سے، یہ سب انکارِ آخرت ہی کی شکلیں ہیں اور اس قسم کا دعوےٰ کرنے والے اگرچہ مدعیانِ اسلام ہوں ہرگز مسلمان نہیں قطعاً دائرۂ اسلام سے خارج اور اصطلاحِ شرع میں مرتدین میں شمار ہیں ۱۲ مترجم عفی عنہ

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) عـــہ۔ نفحات الانس شریف میں ہے کہ ایک صاحب نے زیارتِ اقدس سے مشرف ہو کر عرض کی (باقی صفحہ ۶۵ پر)

وغیرہما کی تکفیر شرعاً واجب ہوگئی۔ اس لئے کہ دعویداران اسلام میں سے کسی اور نے ارسطو کے مذہب کی تقویم اور اُس کے مذہب باطل کی ترویج کی طرف وہ توجہ نہ دی جیسی ان دونوں نے۔ بلکہ دوسروں نے تو ان کے مباحث کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ بات صحیح ہے جسے قبول کیا جائے یا باطل ہے جسے رد کیا جائے۔

(حاشیہ صفحہ ۶۴) کہ غزالی کیسے ہیں؟ فرمایا فَازَ مَقْصُوْدَہٗ۔ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ عرض کی "ابن سینا"؟ فرمایا "بے میرے واسطے کے اللہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک دھول لگائی کہ تحت الثریٰ کو چلا گیا۔

یہ بعض صالحین کا خواب ہے۔ اور امام یافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مراعات الجنان میں ایک روایت یہ تحریر فرمائی کہ ابن سینا آخر عمر میں تائب ہوگیا تھا۔ موت سے کچھ مدت پہلے افیون کھانا چھوڑ دیا۔ باندی غلام سب آزاد کر دیئے۔ رات دن نماز و تلاوت قرآن میں مشغول رہتا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس شعر نے کام دیا۔ (باقی صفحہ ۶۶ پر)

بہرکیف ارسطو کے مباحث کا مجموعہ جو ہم تک پہنچا ہے اُسے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ مباحث جن کے باعث اُس کی تکفیر لازم ہے

(۲) وہ مباحث جن سے اُس کی بد مذہبی ثابت ہوتی ہے۔

(۳) وہ امور جن پر انکار کی کوئی وجہ معقول نہیں۔

اور ہم ان تینوں قسموں پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالتے ہیں۔

فصل (۲) علوم فلاسفہ کی تقسیم

طلب علم کے مقصد و غایت کے اعتبار و لحاظ سے علم فلسفہ چھ قسموں میں منحصر ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۶۵) آنجا کہ عنایتے تو باشد باشد
ناکردہ چو کردہ کردہ چو ناکردہ

رحمت بے سبب کو متوجہ ہوتے دیر نہیں لگتی اسی برس کے بت پرست کو ایک آن میں مسلمان، بلکہ قطب شہر بلکہ ابدال سے بھی اعلیٰ بدلاء سبعہ سے کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مگر امت میں بڑا فتنہ چھوڑ گیا۔ وَحَسْبُنَا اللّٰهُ نِعْمَ الْوَكِيْل

(الملفوظ) مترجم عفی عنہ

(۱) ریاضی (۲) منطق (۳) طبعیات
(۴) الٰہیات (۵) سیاست (۶) علم اخلاق

پھر ریاضی ــ علم حساب ، علم ہندسہ اور علم ہیئت پر مشتمل ہے۔ اور ان علوم کا امورِ شرعیہ سے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ علوم براہین و دلائل سے متعلق ہیں جن پر غور و فکر کے بعد انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن ان سے دو آفتیں پیدا ہوئیں۔

پہلی آفت

اِن علوم کا مطالعہ کرنے والا ان کے نکات و لطائف اور دلائلِ ظاہرہ پر متعجب و حیرت زدہ ہو کر علمِ فلسفہ کا معتقد ہو جاتا ہے اور اُس سے حسنِ عقیدت پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ اس کے حق میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں یہ گمانِ فاسد راسخ ہو جاتا ہے کہ فلسفہ اور اس کے جملہ اقسام اپنے دلائل و براہین میں ایسے ہی ظاہر اور قابلِ وثوق ہیں جیسے علمِ ریاضی۔

پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد اُس کے کان میں اِن فلسفیوں کے وہ کفریات اور لغویات گونجنے لگتے ہیں جو اگرچہ شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہیں لیکن لوگوں کی اذکیہ

زبان پر رہتے ہیں۔ اور اب یہ شخص اُن فلاسفہ کی کورانہ پیروی کے باعث اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے دل و دماغ میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اگر دین و شریعت کے احکام حق و ثابت ہوتے تو ان لوگوں پر کیا پوشیدہ رہتا۔ کہ ان کی نظریں دقیق اور نکتہ شناس تھیں۔ بلکہ جب وہ یہ سنتا ہے کہ ان لوگوں نے دین و ملت پر واقفیت رکھتے ہوئے اسے ٹھکرایا اور انکار کے قابل ٹھہرایا ہے تو یہ احمق اس گمانِ فاسد میں پھنس جاتا ہے کہ دین و ملت کا انکار ہی حق و صحیح ہے۔ وَ الْعِیَاذُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی۔

اور ایسے گم کردہ راہ[ع] تو آپ کی نگاہ میں بھی ہوں گے جن کے پاس (معاذ اللہ دین و ملت کی حقانیت کے خلاف) اِس

ع اور اسی کے مشابہ ہے فرقِ ضالہ میں سے وہابیہ نجدیہ کا یہ گمانِ فاسد کہ فلاں کام قرونِ ثلاثہ میں تو پایا نہیں گیا لہٰذا حرام یا پیشوایانِ دین صحابہ و تابعین نے تو یہ فعل کیا نہیں ہمیں کیونکر روا یا کہتے ہیں کہ تم کیا صحابہ تابعین اور تبع تابعین سے محبت و تعظیم میں زیادہ ہو کہ جو کچھ انھوں نے نہ کیا تم کرتے ہو۔ حالانکہ ہر ذی فہم پر روشن ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اپنے زمانے میں ہونا یا نہ ہونے پر خیر و شر کا مدار نہ تھا بلکہ نفس فعل کو دیکھتے (باقی صفحہ ۶۹

سند کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں (کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اِن عقلاء و حکماء کے انکار کی کیا وجہ ؟)

ایسوں سے یہی کہا جائے گا کہ دیکھو جو شخص کسی علم و فن میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ہر علم و فن میں کامل ماہر ہو۔ مثلاً ایک شخص فقہ و کلام پر کافی عبور رکھتا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ طبیب حاذق بھی ہو۔ یوں ہی جو شخص معقولات میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا تو کیا ضرور ہے کہ اُسے علم و نحو کے مسائل و مباحث بھی معلوم نہ ہوں بلکہ ہر مردے و ہر کارے (ہر کسے را بہر کارے ساختند) والا معاملہ ہے، کہ جنھیں کسی علم پر عبور حاصل ہے وہ اُسی میدان کے شہسوار ہیں۔ اور دوسرے علوم و فنون کے اعتبار سے ناکارہ و ناواقف محض۔

پھر ایک بات اور بھی ہے کہ علم ریاضی کے ابتدائی مباحث اگرچہ دلائل و براہین سے مربوط ہیں لیکن الٰہیات

(حاشیہ صفحہ ۶۸) اگر اس میں کوئی محذور شرعی نہ ہوتا اجازت دیتے ورنہ منع فرماتے۔ غرض قاعدہ شرعیہ وہی قرار پایا کہ حسن حَسن ہے اگرچہ نیا ہو۔ اور قبیح قبیح ہے گو پرانا ہو۔۱۲
مترجم عفی عنہ

میں ان کی حیثیت قیاس اور تخمینہ سے بڑھ کر نہیں۔ اور یہ حقیقت ان حضرات پر خوب روشن ہے جو تجربہ کار اور نکتہ شناس ہیں۔

لیکن عجیب بات ہے کہ یہی تقریر اگر کسی ایسے کے روبرو کی جائے جو ان کی کورانہ پس روی کے باعث کفر و الحاد تک پہنچ چکا ہے تو وہ اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ بلکہ نفسانیت، باطل کی چاہت اور کجروی سے محبت کے باعث وہ اُن کے ساتھ زیادتِ عقیدت پر آمادہ اور اس بات پر مستعد نظر آئے گا کہ فلاسفہ کے ہر علم و فن کی تحسین کرے اور اُن کی ہر تحقیق کو سراہے اور یہ آفت پہلی آفت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

[اس لئے ہم کہتے ہیں کہ علوم ریاضیہ میں انہماک رکھنے والے کو اس سے روکنا بلکہ ہو سکے تو جھڑک دینا چاہئے۔ کیونکہ یہ علوم اگرچہ دین و شریعت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، لیکن ہیں تو علمِ فلسفہ کے مبادی یعنی ابتدائی مسائل و بنیادی مباحث۔ اس لئے فلاسفہ کا شر اور شومی کا اس طالب علم میں سرایت کر جانا ایک ناگزیر امر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علومِ ریاضیہ میں منہمک رہنے والے علوم شرعیہ سے بے تعلق سے ہو جاتے ہیں۔ اور تقویٰ و طہارت کی باگ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے

دوسری آفت :-

وہ ہے جو اسلام کے نادان دوستوں میں پیدا ہوئی ہے یعنی اُنھیں یہ گمان ہوا کہ ہر وہ علم جو علوم فلسفہ سے کوئی تعلق و رابطہ رکھتا ہے اُنھیں قطعاً رد کرنا ہی نصرتِ اسلام ہے اور اور اس جوش نے یہاں تک ترقی کی کہ کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کے بارے میں جو اُن کی تحقیقات و مقالات ہیں اُنھیں بھی خلافِ شریعت سمجھ کر نہ مانا۔

لیکن ایسے لوگوں کا انکار جب اُن لوگوں کے کانوں میں پڑا جو اس قسم کے مسائل ریاضیہ کو براہین و دلائل سے ثابت مان کر قبول کر چکے تھے تو اُنھیں ریاضی کے ان دلائل و براہین پر تو کوئی شک نہ ہوا۔ البتہ اس آفتِ شدیدہ میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں اسلام کی بنیاد (معاذ اللہ) جہل و انکارِ دلائل پر تو نہیں۔ اس لئے اس کے دل میں فلسفہ کی محبت اور اسلام سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ (والعیاذ باللہ)

اسی لئے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو مسلمان ان خیالات پر اڑے ہوئے ہیں کہ علومِ ریاضیہ کی مطلقاً تردید ہی اسلام و مسلمین کی تائید ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس لئے کہ شریعتِ اسلامیہ کو اِن علوم سے کوئی تعرض ہی نہیں۔ اسلام نے نہ اِن علوم کا انکارِ کلی کیا نہ ان کا اقرارِ یقینی۔ اور نہ اِن علوم میں

احکامِ شرعیہ سے مزاحمت (ٹکراؤ) کا کوئی خاص خطرہ ہے۔ بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں کہ "اللہ عزوجل کسی کی موت وحیات کے سبب اپنی یہ نشانیاں ظاہر نہیں فرماتا ولیکن اس سے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ لہٰذا جب ان میں سے کچھ دیکھو تو ذکر و دعا و استغفار کی طرف گھبرا کر اُٹھو" علمِ ہیئت کے ان بیانات کی کوئی تردید نہیں پائی جاتی۔ جن سے سورج اور چاند کی حرکت اور ان کا کسی حالتِ مخصوصہ میں اجتماع و مقابلہ ثابت کیا جاتا ہے۔

اور یہ الفاظ جو حدیث شریف کی طرف منسوب ہیں کہ "جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی چیز پر تجلی فرماتا ہے تو وہ اُس کے لئے سرنگوں ہو جاتی ہے" تو یہ زیادت صحاح ستہ میں سے کسی حدیث کی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

علوم فلسفہ کی دوسری قسم منطقیات

اب منطقیات کو لیجئے تو ان میں سے بھی کوئی بحث علوم شرعیہ سے اثباتاً یا نفیاً کوئی خاص رابطہ نہیں رکھتی بلکہ علم منطق میں تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دلائل وقیاسات کو کس طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ برہان کے مقدمات کی شرائط کیا ہیں؟ ان میں باہمی ترکیب اور حد صحیح کی شروط اور اُن کی کیفیت ترتیب

کیا ہے ؟ اور یہ کہ علم یا تصور ہے یا تصدیق ۔
تصور کو ہم حد کے ذریعے حاصل کرتے ہیں ۔
اور تصدیق کی معرفت کا طریقہ دلیل و برہان ہے ۔
اور یہ چیزیں ایسی نہیں جن کا انکار کر دیا جائے ۔ بلکہ یہ تو وہی باتیں ہیں جو متکلمین اور دوسرے اہل نظر نے علم کلام میں بیان کی ہیں ۔ فرق ہے تو یہ کہ ان کی عبارات و اصطلاحات اور تعریفات و تفریعات جداگانہ ہیں ، اُن کی جداگانہ ۔
مثلاً کلام کا ایک مسئلہ لیجئے وہ کہتے ہیں کہ جب یہ امر ثابت ہے کہ :-
ہر آ' ب ہے (مثلاً ہر انسان حیوان ہے) تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض ب ضرور آ ہے ۔ (یعنی بعض حیوان ضرور ضرور انسان ہیں)
اسی مسئلہ کو منطقی یوں پیش کرتے ہیں کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ جزئیہ ہے ۔ تو اس مسئلہ کو مباحث شرعیہ سے ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں کہ اس کا اقرار یا انکار لازمی ہو ۔
اب اگر کوئی مسلمان اس جیسے کسی مسئلہ کا انکار کر دے تو اس کا لازمی نتیجہ صرف یہی نہیں کہ کسی منطقی کو اس کی عقل کا رونا رونا پڑے ۔ بلکہ اس کے دل میں دین و شریعت حقہ کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گی ۔ اور وہ اس گمان میں مارا جائے گا

کہ دین و شریعت کی بنیادیں ایسی ہی چیزوں کے انکار پر رکھی گئی ہیں (اور اسلام ہر اس چیز کو رد کرتا ہے جو عقلائے زمانہ کی تحقیق کا نتیجہ ہے اگرچہ وہ دین سے نہ ٹکرائے)۔

لیکن اس امر کے باوجود یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ فلاسفہ نے یہاں بھی ٹھوکریں کھائیں اور اپنی خواہشات کا اتباع کیا مثلاً ان لوگوں نے برہان و دلیل کیلئے کچھ ایسے قواعد منضبط کئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نتیجہ و ثمرہ ایک امر یقینی ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب امورِ دینیہ و مسائلِ شرعیہ کی باری آتی ہے تو انھیں اپنی گھڑی ہوئی یہ شرطیں یاد نہیں آتیں، بلکہ غفلت و لاپروائی سے اپنا دامن صاف بچا لے جاتے ہیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ فلاسفہ نے اپنے ان مسائل و مباحث میں کفریات کو مخلوط کر دیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علم منطق کو نظر استحسان سے دیکھنے اور اس علم کو واضح اور مدلل سمجھنے والا جب علم الٰہیات کے ان کفریات کا مطالعہ کرتا ہے جو اس علم میں بطور نقل بیان کئے جاتے ہیں تو وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ دوسرے مباحث و مسائل منطقیہ کی طرح یہ مسائل بھی براہین و دلائل سے ثابت ہیں چنانچہ وہ ان پر ایمان لے آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فلاسفہ کے علم الٰہیات تک پہنچنے سے پہلے ہی کافر ہو جاتا ہے اور یہ مصیبت و آفت اسی علم منطق کی بدولت

اُس پر آتی ہے۔

علومِ فلسفہ کی تیسری قسم (طبعیات)

اِس علم میں عالم سماوات کے اجسام و کواکب (ستارے) اور اُن کے ماتحت اجسام مفردہ مثلاً پانی، ہوا، خاک اور آگ یوں ہی اجسام مرکبہ مثلاً حیوانات نباتات اور معدنیات (جمادات) سے بحث کی جاتی ہے۔ نیز اُن کے تغیرات واستحالات اور امتزاجات کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور یہ بحث ایسی ہی ہے جیسی ایک طبیب علم طب میں انسان کے جسم اور اُس کے اعضائے رئیسہ اور اعضائے خادمہ کو زیر بحث لاتا اور اُس کے مزاج کے تغیرات کو بیان کرتا ہے۔ تو جس طرح کسی مسلمان پر علم طب کے مباحث کی تردید داخل ایمان نہیں، یوں ہی علم طبیعیات کا انکار بھی لازم اسلام نہیں ہے۔

البتہ یہاں بھی چند مباحث ایسے آتے ہیں جو خلافِ حق صریح ہیں۔ ان میں سے کچھ مباحث کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی مسائل ہیں جن کی تردید ہر مسلمان پر لازم ہے اور ان کی تردید کے لئے مسلمان کو یہ عقیدہ اچھی طرح دل میں جما لینا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالےٰ کے حکم کی تابع ہے۔ اپنی جانب سے

وہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کے خالق و پروردگار نے اُسے جس کام پر لگا دیا ہے اُسی میں مصروف ہے۔ یوں ہی چاند، سورج تارے اور طبائع سب اُسی کے مسخر و تابع فرمان ہیں۔ ان میں سے کسی کو بذاتہٖ کسی فعل و کسب پر کوئی قدرت و اختیار نہیں ہے۔

علوم فلسفہ کی چوتھی قسم (الٰہیات)

اس علم میں فلسفیوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ علم منطق میں براہین و دلائل کیلئے جو شرائط قائم کی تھیں اُنھیں یہاں نہ نبھا سکے۔ اسی لئے ان میں باہمی اختلافات بھی بکثرت پائے جاتے ہیں اور ان سب میں ارسطو کا مذہب بنا بر نقل فارابی و ابن سینا مذاہب اہلِ اسلام سے نسبتًہ قریب ہے۔

الٰہیات میں فلسفیوں کے اغلاط یوں تو بہت ہیں۔ لیکن ہم اُنھیں بیس اصول میں منحصر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ہم نے ان بیس مسائل کی تردید اپنے رسالہ "تہافتہ الفلاسفہ" میں تفصیلاً کر دی ہے۔ ان بیس میں سے تین وہ مسائل ہیں جن میں فلاسفہ نے جمہور اہلِ اسلام کا خلاف کیا اور اسلام سے خارج ہو گئے۔

(۱) اجسام کا حشر نہیں ہوگا۔ یعنی روز قیامت یہ اجسام نہ اُٹھائے جائیں گے۔ بلکہ ثواب و عذاب صرف ارواح پر

وارد ہو گا۔ یعنی یہ سزائیں صرف روحانی ہوں گی جسمانی نہیں۔

روحانیات کے اقرار میں یہ فلاسفہ راہِ راست پر چلے اس لئے ارواح ضرور موجود ہیں۔ لیکن جسمانیات کے انکار میں جھوٹے اور خارج از اسلام ہیں۔

(۲) اللہ تعالےٰ کلیات کا عالم ہے جزئیات کا نہیں (معاذ اللہ)

یہ بھی صریح کفر ہے۔ اس لئے کہ حق یہی ہے کہ حضرت عزت عزاسمہٗ کے علم سے زمین و آسمان کا ایک ذرّہ بھی غائب نہیں۔

عہ عذاب روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ یوں ہی ثواب بھی۔ حدیث شریف میں ہے ایک لُنجا کسی باغ میں پڑا تھا اور میوے دیکھ رہا تھا۔ مگر اُس تک جا نہ سکتا تھا۔ اتفاقاً ایک اندھے کا اُدھر سے گذر ہوا کہ باغ میں جا سکتا تھا مگر میوے اُسے نظر نہ آتے تھے۔ لُنجے نے اندھے سے کہا کہ تو مجھے باغ میں لے چل وہاں جا کر ہم اور تم دونوں میوے کھائیں۔ اندھا اُس کو اپنی گردن پر سوار کر کے باغ میں لے گیا۔ لُنجے نے میوے توڑے اور دونوں نے کھائے۔ اس صورت میں کون مجرم ہو گا۔ دونوں ہی مجرم ہیں۔ اندھا جسم ہے اور لُنجا روح۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ۔

عہ۔ اُس کا علم ہر شے کو محیط ہے یعنی جزئیات (باقی صفحہ ۷۸ پر)

خود قرآن کریم کا ارشاد ہے لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ) اور خدا کی بات سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۱۲

(۳) تمام جہان ازلی اور قدیم ہے (یعنی حادث نہیں ہمیشہ سے یوں ہی چلا آرہا ہے۔)

فلاسفہ کے یہ تین وہ کفری عقائد ہیں جن کا اسلامی فرقوں میں سے کوئی فرقہ قائل نہیں۔ اور ان کے علاوہ کچھ وہ عقائد ہیں جن کی طرف فرقۂ معتزلہ گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ صفاتِ باری تعالیٰ

(حاشیہ صفحہ ۷۷) کلیات، موجودات، معدومات، ممکنات محالات سب کو ازل میں جانتا تھا اور اب جانتا ہے اور ابد تک جانے گا۔ اشیاء بدلتی ہیں اُس کا علم نہیں بدلتا۔ دلوں کے وسوسوں اور خطروں پر اُس کو خبر ہے۔ اور اُس کے علم کی کوئی انتہا نہیں۔ تمام اہلِ عالم اگلے پچھلوں سب کے جملہ علوم جمع کئے جائیں تو اُن کو علومِ الٰہیہ سے وہ نسبت نہ ہوگی جو ایک بوند کے دس لاکھ حصوں سے ایک حصّے کو دس لاکھ سمندروں سے۔ اس لئے کہ وہ تمام سمندر اور یہ بوند کا حصّہ دونوں متناہی ہیں اور متناہی کو متناہی سے نسبت ضرور ہے بخلاف علومِ الٰہیہ کہ غیر متناہی در غیر متناہی در غیر متناہی ہیں تو جملہ علومِ خلق کو علومِ الٰہی سے نسبت ہونی محال ہے۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ

غیر ذات نہیں، عین ذات ہیں کہ وہ (مثلاً) اپنی ذات سے عالم ہے۔ اُس کی یہ صفت علم اُس کی ذات کی غیر نہیں۔
اور یہ وہ مسائل ہیں جن پر فرقہ معتزلہ کی تکفیر نہیں کی گئی[ع]

ع اسلام فقط طوطے کی طرح زبان سے کلمہ رٹ لینے کا نام نہیں اور نہ حدیث شریف مَنْ قَالَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (کہ جس نے "لا الٰہ الا اللہ" کہہ لیا جنت میں جائے گا) کا یہ مطلب کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ" کہہ لیا اب وہ چاہے خدا کو جھوٹا کہے۔ اُس کے رسول کی تکذیب کرے ضروریاتِ دین کا مذاق اُڑائے۔ جنت و نار، ملائکہ و جن و ابلیس و حشر و نشر کی اوندھی تاویلیں کر کے اصل حقیقت کو جھٹلائے اُس کا اسلام نہیں بدل سکتا ہے۔

دیکھیئے منافقین کی لمبی چوڑی کلمہ گوئی، قسم قسم کی تاکیدوں سے مؤکد، طرح طرح کی قسموں سے مؤید ہرگز موجب اسلام نہ ہوئی اور اللہ واحد قہار نے اُن کے جھوٹے کذاب ہونے کی گواہی دی (سورۂ منافقون) ہاں جو کلمہ پڑھتا اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو ہم اُسے مسلمان جانیں گے جب تک اُس سے کوئی کلمہ کوئی حرکت کوئی فعل منافی اسلام نہ صادر ہو۔ بعد صدور منافی کلمہ گوئی یا قبلہ روئی ہرگز کام نہ دے گی۔ قرآن کریم نے

تو اِن مسائل و اعتقادات پر فلاسفہ کی تکفیر بھی نہیں کی جاتی گی بلکہ اُن کی تکفیر اُن کے اور عقائد باطلۂ کفریہ پر کی گئی ہے اور

(حاشیہ صفحہ ۷۹) اُن لوگوں کو جو نماز روزے والے ہوں اور دین پر طعنہ کریں، کفر کا پیشوا اور کافروں کا سرغنہ فرمایا (فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ الْاٰیۃ)

غرض اصل بات یہ ہے کہ اصطلاحِ ائمہ و محاوراتِ قرآن و حدیث میں مسلمان یا اہلِ قبلہ وہ ہے کہ تمام ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتا ہو۔ اُن میں سے ایک بات کا بھی منکر ہو تو قطعاً یقیناً اجماعاً کافر و مرتد ہے۔ اور ایسا کہ جو اُسے کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے۔ ہاں جس مسلمان سے کوئی لفظ ایسا صادر ہو جس میں سَو پہلو نکل سکیں اُن میں ۹۹ پہلو کفر کی طرف جاتے ہوں اور ایک اسلام کی طرف تو جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اُس نے خاص کوئی پہلو کفر کا مراد رکھا ہے۔ ہم اُسے کافر نہ کہیں گے کہ آخر ایک پہلو اسلام کا بھی تو ہے۔ کیا معلوم شاید اُس نے یہی پہلو مراد لیا ہو۔ اور یہ بات جو جہال میں مشہور ہے کہ جس میں ۹۹ باتیں کفر کی اور ۱ اسلام کی ہو وہ مسلمان ہے قرآن و حدیث پر افتراء اور تمام اُمت کے اجماع کے خلاف ہے کہ اسکی رُو سے تو سوا دہریئے کے کہ سرے سے خدا کے وجود کا منکر ہو تمام کافر مشرک، مجوس، یہود، نصاریٰ، ہنود وغیرہم سب مسلمان ٹھہرے جاتے

ہم نے اپنی کتاب "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ" میں اس امر پر خوب روشنی ڈالی ہے کہ وہ شخص یقیناً غلطی پر ہے جو اپنے مذہب و مسلک کے ہر مخالف پر کفر کا فتوےٰ[عـــہ۵] جڑ دے۔

(حاشیہ صفحہ ۸۰) ہیں کہ آخر وجود خدا کے تو قائل ہیں اور یہی ایک بات سب سے بڑھ کر اسلام کی بات بلکہ تمام اسلامی باتوں کی اصل الاصول ہے۔ ۱۲ مترجم۔

عـــہ۵۔ جیسے اس دورِ پرفتن میں وہابیہ نجدیہ و خوارج کا شعار ہے کہ بات بات پر اہلِ اسلام پر بدعت و شرک کا حکم جڑتے اور عامۂ مومنین کو مشرک و خارج از اسلام و مستحق نارِ جہنم سمجھتے ہیں اور وہ آیات جو کفار اہلِ کتاب اور اُن کے عمائد و ارباب میں اُتریں ہمیشہ یہ بیباک لوگ اہلِ سنت و ائمۂ اہلِ سنت کو اس کا مصداق بتاتے اور اشرار یہود کے حق میں جو آیتیں نازل ہوئیں انھیں امتِ مرحومہ محفوظہ کے علماء پر ڈھالتے ہیں۔ اصل اس گروہ ناحق پژوہ کی نجد سے نکلی۔ حاصل اُن کے عقائد زائغہ کا یہ تھا کہ عالم میں وہی مشتِ ذلیل موحد مسلمان ہیں۔ باقی تمام مومنین معاذ اللہ مشرک۔ وہاں سے یہ فتنہ دار الفتن ہند میں آیا اور وہی رنگ و آہنگِ کفر و شرک پکڑا کہ ان معدودے چند کے سوا تمام مسلمان مشرک والعیاذ باللہ ۱۲ مترجم عُفی عنہ

علومِ فلسفہ کی پانچویں قسم (سیاست)

اِس علم میں ان کے تمام مباحث کا مرجع و ماحصل وہ وہ امور ہیں جو دنیاوی حکومت و سلطنت سے متعلق ہیں اور ان تمام باتوں کا ماخذ وہ آسمانی کتابیں اور صحیفے ہیں جو حضرات انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئیں۔ یا وہ حکمتیں ہیں جو اولیائے سلف پر منکشف ہوئیں۔

(اور اسی لئے یہ علم ان کے مہملات و لغویات سے عموماً پاک ہے)

علومِ فلسفہ کی چھٹی قسم (علمِ اخلاق)

اس علم میں فلاسفہ کے تمام کلام کا خلاصہ نفس کے صفات و اخلاق اور اُن کے اجناس و انواع اور نفس کے معالجہ و مجاہدہ کی کیفیت کے بیان میں منحصر ہے اور یہ علم بھی ان فلاسفہ نے حضرات صوفیائے کرام کے اقوال سے اخذ کیا ہے جو عشقِ الٰہی کے متوالے، یادِ الٰہی میں ڈوبے رہتے والے خواہشاتِ نفس کا خلاف کرنے والے اور دنیا کی دلفریبیوں سے منہ موڑ کر راہِ مولیٰ میں قدم بڑھانے والے ہیں۔ صوفیائے کرام قدست اسرارہم کو اپنے مجاہدات میں نفس کے جو محاسن

وفضائل اور عیوب ورذائل روشن و ہویدا ہوئے اور ان حضرات نے اُنھیں بیان وتحریر فرمایا۔ فلاسفہ نے ان سے کچھ اصولی باتیں لے کر اپنے کلام میں ملا دیں تاکہ اس پاکیزہ کلام کے ذریعے اپنے کلامِ باطل کو رواج دیں۔

اور یہ بات کبھی نہ بھولئے کہ فلاسفہ سلف کے زمانہ میں بھی حق کے متوالوں کا یہ گروہ موجود تھا۔ بلکہ اس کے وجود سے تو زمانہ کبھی خالی ہی نہ رہا۔ ہر قرن اور ہر زمانہ میں اہلِ حق کی کوئی نہ کوئی جماعت ضرور موجود رہی۔ اور کیوں نہ ہو کہ یہی حضرات تو زمین کی میخیں ہیں۔ انھیں کی برکت سے رحمت کا نزول ہوتا ہے اور زمین والے ان سے فیض پاتے ہیں۔

خود احادیث کریمہ میں وارد ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عـہ بِهِمْ يُمْطَرُوْنَ وَبِهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔

عـہ فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم کہ بے شک اللہ تعالےٰ کے لئے خلق میں تین سو اولیا رہیں کہ اُن کے دل قلب آدمؑ پر ہیں اور چالیس کے دل قلب موسیٰؑ اور سات کے قلب ابراہیمؑ اور اور پانچ کے قلب جبریلؑ اور تین کے قلب میکائیل اور ایک کا دل قلب اسرافیل پر ہے۔ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالتَّسلیم (باقی صفحہ ۸۴ پر)

اُنھیں اولیائے الٰہی کے طفیل لوگوں پر مینھ برسایا جاتا ہے انھیں کے طفیل اُنھیں رزق دیا جاتا ہے۔" انھیں اولیائے الٰہی میں اصحابِ کہف بھی ہیں جن کا واقعہ قرآن کریم میں بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔

الغرض جب فلاسفہ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حضرات صوفیائے عظام رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم کے کلام کو اپنے کلام میں مخلوط اور اپنی کتابوں میں مندرج کر دیا تو اس سے دو آفتیں برپا ہوئیں۔

پہلی آفت تو خود انھیں لوگوں پر آتی ہے جو اس علم کے قائل ہیں۔

دوسری آفت کا شکار وہ لوگ ہیں جو اس علم کے منکر بلکہ اُس کی تردید کرنے والوں میں ہیں۔ اور یہ وبال پہلے وبال سے بڑھ کر ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض ضعیف الاعتقاد مسلمان جب اُن

(حاشیہ صفحہ ۸۳) جب وہ ایک مرتا ہے تین میں سے کوئی اُس کا قائم مقام ہوتا ہے اور جب ان میں سے کوئی انتقال کرتا ہے تو پانچ میں سے اس کا بدل کیا جاتا ہے اور پانچ والے کا بدل سات اور سات کا چالیس اور چالیس کا تین سو اور تین سو کا عام مسلمین میں سے۔ انھیں تین سو چھپن ۳۵۶ اولیاء کے ذریعہ سے خلق کی حیات موت مینھ کا برسنا نباتات کا اُگنا بلاؤں کا نازل ہونا ہوا کرتا ہے (ابو نعیم ابن عساکر) ۱۲ مترجم عفی عنہ

گرامی بزرگوں کا کلام اِن فلسفیوں کی تحریرات میں مخلوط دیکھتے اور پھر دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی کر لینے پر قدرت نہیں پاتے تو وہ تمام مباحث و مسائل کو یکساں گمان کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ فلسفہ سے اُنھیں کوئی رغبت نہیں بلکہ اُن کے دل اس علم سے نفور ہیں تو اس علم سے انکار کے ضمن میں وہ اُن حضرات عالیات کے اقوال کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ چھوڑ بیٹھتے ہیں بلکہ اُن کی بے التفاتی یہاں تک ترقی کر جاتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اُس کے تذکرہ سے روک دیتے اور اُسے بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام مسلمین تک یہ باتیں انھیں فلسفیوں کے ذریعہ پہنچیں۔ اور یہ بات اُن کے دل میں پہلے ہی راسخ ہے کہ فلاسفہ اہلِ باطل ہیں اور اُن کا کلام بطلان پہ مبنی ہے۔

اور یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی مسلمان کسی نصرانی سے سُنے کہ " لاالہ الااللّٰہ عیسٰی رسول اللّٰہ" اور اس کا انکار کر بیٹھے اور بلا توقف کہے کہ یہ تو نصرانی کا کلام ہے مجھے قبول نہیں۔ حالانکہ اس امر کا لحاظ لازم و ضروری ہے کہ نصاریٰ کی تکفیر کی بنا اُن کا یہ قول نہیں کہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا رسول کہتے ہیں (اس لئے کہ وہ تو یقیناً رسول ہیں۔ اور اُن پر اور

اُن کی رسالت پر ایمان لانا فرض ہے) ہاں اُنھیں کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حضور پر نور شافع یوم النشور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وبارک وسلم کی نبوت کے منکر ہیں اُنھیں نبی نہیں مانتے۔

اور جبکہ اُن کی تکفیر کی بنیاد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ورسالت کے انکار پر ہے تو وہ امور جنھیں وہ خود بھی حق جانتے و مانتے ہیں اور وہ فی نفسہ بھی حق ہیں کہ شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے خلاف نہیں تو ایسے امور کی مخالفت کرنا اور اُنھیں کافر کہنا کس طرح جائز و حلال ہو سکتا ہے۔ عام طور پر یہ حالت ضعیف الاعتقاد اور خفیف العقل انسانوں میں پائی جاتی ہے جو حق کو آدمی سے پہچانتے ہیں آدمی کو حق سے نہیں۔ لیکن ارباب عقول کی نظریں سید العقلاء حضرت مولےٰ علی مشکل کشا کرم اللہ تعالےٰ وجہہٗ کے اس مبارک قول پر رہتی ہیں کہ راستبازی اور حقانیت آدمیوں کے ذریعہ نہیں پہچانی جاتی۔ پہلے حق پہچانو پھر اہل حق کی معرفت بھی حاصل ہو جائے گی۔ لہٰذا عقلمند پہلے حق کی معرفت حاصل کرتا ہے پھر کسی کے قول پر نظر ڈالتا ہے۔ اگر اُسے حق کے موافق پاتا ہے قبول کرتا ہے عام ازیں کہ اس کا قائل راہ راست پر ہو یا گمراہ۔

بلکہ ان میں جو اہلِ فراست ہوتے ہیں وہ گمراہوں کے کلام سے حق اخذ کر لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سونا کبھی راکھ میں بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً ایک ہوشیار صراف کسی حیلہ گر کی تھیلی میں اس لئے ہاتھ ڈالتا ہے کہ خراب سونے میں سے اچھا سونا چھانٹے یا کھوٹے کھرے کو پہچان لے تو اس پر کون سا الزام قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس معاملہ میں چشم بصیرت رکھتا ہے۔

ہاں، ایک گنوار یا دیہاتی اگر کسی حیلہ ساز سے معاملہ کرتا ہوا دیکھا جائے گا تو اُسے ضرور تنبیہ کی جائے گی' اس لئے کہ وہ نگاہِ فراست سے محروم ہے ممکن ہے کہ فریب میں آجائے۔ یوں ہی سمندر کے کنارے ناتجربہ کار بچے کو جانے سے روکیں گے کہ کہیں پھسل نہ جائے نہ کہ اس تیراک کو جو اپنے فن میں کمال رکھتا ہے۔ اسی طرح بچہ اگر سانپ پر ہاتھ ڈالے تو اُسے باز رکھیں گے، نہ کہ کسی شعبدہ باز مداری کو جو اپنے فن میں طاق ہے۔

اور یہاں تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی سمجھ بوجھ پر کامل اعتماد رکھتے اور بزعم خویش نکتہ شناس و معاملہ فہم بنتے اور کہتے ہیں کہ ہم اپنے علم و عقل سے حق و باطل میں تمیز اور ہدایت و گمراہی میں فرق کر سکتے ہیں تو اگر ہم ان باطل

پرستوں کی تحریرات دیکھیں تو ہم پر ان کا کیا اثر ہوگا؟
حالانکہ انھیں وہ بصیرت و فراست حاصل نہیں، یہ
محض ان کا خیالِ خام ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جس طرح
بن پڑے اس دروازے[۱] ہی کو بند کر دیا جائے۔ یعنی ایسے

---

[۱] لوگ اپنی جہالت سے گمان کرتے ہیں کہ ہم اپنے دل سے
مسلمان ہیں تو خواہ ہم اُن کے جلسوں میں جائیں اور تقریر سنیں یا اُن کی
کتابیں اُٹھائیں اور تحریر پڑھیں ہم پر ان کا کیا اثر ہوگا۔ لَاوَاللہِ۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "جو دجّال کی خبر سنے اُس پر واجب
ہے کہ اس سے دُور بھاگے کہ خدا کی قسم آدمی اُس کے پاس جائے
گا اور یہ خیال کرے گا کہ میں تو مسلمان ہوں یعنی مجھے اس سے کیا
نقصان پہنچے گا وہاں اُس کے دھوکوں میں پڑ کر اُس کا پیرو ہو جائے
گا (ابوداؤد) پھر کیا دجال ایک اُسی خبیث دجال کو سمجھتے ہو جو
آنے والا ہے۔ حاشا تمام گمراہوں اور بدمذہبوں کے داعی منادی
سب اسی کے حکم میں داخل ہیں۔ اور سب سے دُور بھاگنے اور علیحدہ
رہنے کا حکم فرمایا اور اس میں یہی اندیشہ بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ " آخر زمانہ میں دجال کذاب لوگ
ہوں گے کہ وہ باتیں تمہارے پاس لائیں گے جو نہ تم نے سنیں نہ
تمہارے باپ دادا نے۔ تو اُن سے دُور رہو اور اُنھیں اپنے سے

کم علموں اور نا واقفوں کو ہر گز اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ کسی بد مذہب و بد دین کی کسی تحریر کا مطالعہ کریں۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس آفتِ قبول سے دامن نہ بچا سکیں گے جس کا ہم عنقریب ذکر کرنے والے ہیں۔ اگرچہ اس آفت سے بچ جائیں جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ یعنی آفتِ رد۔

اور میں نے اپنی بعض تصانیف مثلاً احیاء العلوم وغیرہ میں جو کہیں کہیں احکامِ شریعت کے اسرار و حکم پر تبصرہ کیا اور انھیں حیطہ تحریر میں لایا تو اُن پر اعتراضات کی بوچھار کرنے والے بھی کچھ اسی قسم کے علماء کرام تھے جنھیں شریعتِ مطہرہ کے اسرار و رموز پر وہ بصیرت و دقتِ نظر میسر نہ تھی جو حاملانِ دین متین و علماء شرعِ مبین کو دین و ملت کے اغراض و مقاصد کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے اور اُن کی نگاہوں میں احکامِ الٰہیہ کی مصلحتیں گھومتی رہتی ہیں۔ یہی

(حاشیہ صفحہ ۸۸) دُور رکھو۔ کہیں وہ تمھیں گمراہ نہ کر دیں۔ کہیں وہ تمھیں فتنہ میں نہ ڈال دیں۔" (مسلم شریف) رب عزوجل فیصلہ فرما چکا ذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ۔ چھوڑ دے اُنھیں اور اُن کے بہتانوں کو۔

حبّ اللہ واحد القہار اور اُس کے محبوب نبیِ مختار جل وعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گواہی ہے تو اہلِ اسلام پر جملہ مرتدین و مبتدعین سے دُور و نفور رہنا لازم و فرض ہے۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ۔

وجہ تھی کہ میری تحریرات میں اس قسم کے مباحث کو ان حضرات علمائے اسلام نے فلسفیانہ خیالات تصور فرمایا اور یہ حکم لگا دیا کہ یہ مسائل اہلِ اسلام کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنے اور معاذ اللہ اُنھیں صراط مستقیم سے ڈگمگا دینے والے ہیں۔

حالانکہ یہ اُن حضرات کی غلطی تھی۔ وہ اگر غور و تامل سے کام لیتے تو اُن پر یہ امر واضح تر ہو جاتا کہ وہ صرف فلسفیانہ مباحث نہیں۔ بلکہ اُن میں بہت سی باتیں وہ بھی آ گئی ہیں جو بجنسہٖ کتب شرعیہ میں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ کم از کم ان کا مفہوم تو ضرور اُن کی تحریرات میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بعینہٖ وہ عبارتیں فلاسفہ کی کتابوں کے سوا کہیں اور نہ پائی جائیں۔ لیکن جبکہ یہ مباحث فی نفسہا معقول و مقبول اور دلائل و براہین سے مؤید ہیں اور ساتھ ہی کتاب و سنت کے مخالف نہیں تو یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ محض فلاسفہ کی طرف نسبت کے باعث قطعاً ناقابلِ التفات ہوں اور اُن کی تردید و تغلیط لازمی و ضروری ہو جائے۔

اور پھر ذرا غور تو فرمائیے۔ اگر ہم یہ دروازہ کھلا رکھیں۔ یعنی ہر ایسے امر کا انکار کر دیں جو اہلِ باطل کی تحقیق کا نتیجہ ہو۔ اگرچہ وہ فی نفسہٖ حق و صحیح (اور شریعتِ مطہرہ کے کسی حکم کے خلاف نہ) ہو تو ہم بہت سی حق باتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ نہیں نہیں بلکہ لازم

آئے گا کہ ہم اُن تمام حکایاتِ سلفِ صالحین اور کلماتِ صوفیائے کاملین بلکہ آیاتِ کریمہ و احادیث حمیدہ کو یکلخت ترک کر دیں۔ جو مصنف اخوان الصفار نے اسی کتاب میں لبطور شہادت اِس لئے پیش کرتا ہے کہ ان کے ذریعے ناواقفوں اور جاہل احمقوں کے دل علوم فلسفہ کے باطل مضامین کی طرف مائل کرے۔

اور یہی نہیں بلکہ ایک اور بڑی زبردست خرابی یہ پیدا ہو گی کہ اہلِ باطل ہمارے ہاتھوں سے بہت سی حق باتیں جھپٹ لیں۔ اس لئے کہ اُنھوں نے بکثرت حق و صداقت کی باتیں اپنی کتابوں میں درج کر دی ہیں۔

غرض یہ کہ کم از کم علمار حق پرست پر اتنا تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو عوام الناس سے ممتاز و جدا رکھیں اور شہدِ لطیف کسی جرّاح کے تجربہ گاہ میں دیکھیں تو اُسے قابلِ نفرت نہ جانیں اس لئے فصد لگانے والے کی فصد گاہ شہد کی ذات وحقیقت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اور ایسے شہد سے اگر کسی عامی و جاہل کو نفرت ہے تو یہ خود اس کی جہالت پر مبنی ہے کہ فصد گاہ خراب خون کے خارج کرنے کیلئے بنائی گئی ہے اور وہاں جو خون پایا جاتا ہے وہ خراب خون ہے۔ حالانکہ اُسے اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ خون کا فساد تو خود اُس کی ذات میں موجود ہے۔ خون اس لئے گندہ نہیں کہ وہ فصد گاہ میں پایا جاتا ہے۔ اور

جب وہ وصف شہد کی ذات میں موجود نہیں تو شہد کو اس لئے ہرگز فاسد و خراب نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا برتن فصدگاہ میں پایا جاتا ہے۔

اور طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ بکثرت مخلوق اس وہم میں گرفتار ہے کہ اگر اُن کے سامنے کوئی ایسی بات کہی جائے جو ایسے لوگوں کی منسوب ہے جن پر یہ اعتقاد رکھتے ہیں تو فوراً اُسے حق مان کر قبول کر لیتے ہیں اگرچہ وہ فی نفسہٖ غلط و باطل ہو۔ اور جب کوئی بات کسی ایسے کی طرف منسوب ہو جس سے یہ بد اعتقاد ہیں تو بلا تامل اُسے رد کر دیتے ہیں اگرچہ وہ حق صریح و صحیح ہو۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عموماً لوگ حق کو آدمیوں سے پہچانتے ہیں نہ کہ آدمیوں کو حق سے اور یہ چیز سخت گمراہ کُن ہے۔

یہ آفت آفتِ رَد ہے۔

دوسری آفت

آفتِ قبول ہے یعنی یہ کہ جو شخص فلاسفہ کی کتابوں مثلاً اخوان الصفا وغیرہ کا مطالعہ کرے گا اور اُن کے کلام میں اسرارِ نبوت اور کلماتِ صوفیائے کرام رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم کو پائے گا جنھیں ان فلاسفہ نے اپنی تحریرات میں مخلوط کر دیا ہے تو وہ انھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھ کر قبول کر لے گا (اور یہ کوئی خطرہ کی بات

نہیں بلکہ یہ کلام تو قابلِ قبول ہی ہے۔ ہاں عظیم خطرہ یہ ہے کہ اس شخص کے دل میں فلاسفہ کی طرف سے خوش عقیدگی پیدا ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ احکامِ شریعت و کلماتِ تصوف کو آڑ بنا کر فلاسفہ جن مسائلِ باطلہ کی تبلیغ کرتے ہیں وہی مسائل آہستہ آہستہ اُس کے دل میں اترتے رہیں گے۔ اور یہ شخص حق کے ساتھ ملائے ہوتے عقائد باطلہ کو قبول کرتا رہے گا۔ اُن کے خیالات کی تعریف کرے گا۔ اور یہی چیز اُسے رفتہ رفتہ دین حق سے ہٹا کر بد دینی اور گمراہی کی طرف لے جائے گی۔

وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ عامۂ اہلِ اسلام میں سے جب کسی شخص کو ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتا پایا جائے تو اُسے فوری تنبیہ بلکہ سختی سے باز رکھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ کسی بڑی آفت میں پھنس کر اسلام کا دامن نہ چھوڑ بیٹھے۔ اور کسی اور خرابی میں نہ پڑ جائے

اور میں پہلے بتا چکا کہ جس طرح دریا کے پھسلنے کناروں پہ جانے سے اُس نا سمجھ کو روکنا ضروری ہے جو دریا میں تیرنا نہیں جانتا، اسی طرح ناواقف اور کم علم عوام کو ایسی کتابوں کے مطالعہ سے روکنا اور بچانا ہم پر واجب ہے اور جس طرح بچوں کو سانپ کے چھونے سے روک دینا آپ ضروری سمجھتے

ہیں اُسی طرح ایسے کلمات کے سننے سے کانوں کو بچانا ضروری خیال کرنا چاہئیے۔ بلکہ جس طرح کوئی شعبدہ باز مداری اپنے ناسمجھ بچوں کے سامنے اس لئے سانپ کو ہاتھ نہیں لگاتا کہ کہیں اُس کے بچے بھی اُس کی ریس نہ کرنے لگیں۔ اور بچوں کے سامنے خود بھی سانپ سے خوف کھاتا، اور بچوں کو خوف دلاتا ہے۔ اسی طرح ایک عالم مقتدا پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کے سامنے نہ خود ایسی کتابیں دیکھے نہ اُنھیں دیکھنے دے۔ بلکہ ضرور ہے کہ ایسی کتابوں کے مفاسد پہ اُنھیں تنبیہ کرتا رہے۔

بلکہ غور کیجئے اپنے فن میں مہارت رکھنے والا بازی گر جو تریاق اور زہر کو خوب پہچانتا ہے جب کسی سانپ پہ قابو پاتا ہے تو اُس سے تریاق حاصل کر کے زہر کو دُور پھینک دیتا اور وقتِ ضرورت کسی حاجتمند کو یہ تریاق بلا دریغ بخش دیتا ہے۔

یوں ہی کھرے کھوٹے کو پرکھنے اور اصلی و نقلی میں تمیز رکھنے والا صراف جب کسی حیلہ گر کی تھیلی میں ہاتھ ڈالکر خالص اور آمیزش سے پاک سونے کو نکال لیتا اور ردی اور خراب کو وہیں چھوڑ دیتا ہے تو اب یہ خالص اور عمدہ سونا بلا تردّد خواہشمندوں کو دے دیتا ہے۔

اور جب اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ فرض بصورت دیگر علمائے اسلام پر بھی عائد ہوتا ہے جس سے انھیں کوئی چارہ نہیں۔

اور جب کوئی تریاق کا خواستگار تریاق کو یہ کہہ کر چھوڑ دے کہ وہ سانپ سے حاصل کیا گیا ہے اور سانپ میں زہر ہوتا ہے یا کوئی مفلس و نادار جسے مال کی حاجت ہے سونا لینے سے اس لئے انکار کر دے کہ وہ حیلہ ساز کی تھیلی سے نکالا گیا ہے تو اسے سمجھایا جائے گا کہ تمھارا یہ انکار محض تمھاری ناواقفی اور کم علمی کا نتیجہ ہے جس کے باعث تم اس عظیم فائدے سے محروم ہو رہے ہو جس کا حاصل کرنا تمھارا مطلوب ہے

بھلا غور تو کرو خالص سونا اگر کھوٹے سونے کے پاس رہا تو اس کا کھوٹ اس میں کیونکر آ گیا۔ اور اگر بات یوں ہی ہے تو کھرے سونے نے کھوٹے کو کیوں کھرا نہ بنا دیا۔ تو جس طرح کھوٹا سونا کھوٹا ہی رہا، اسی طرح مجرد اتصال نے کھرے اور خالص سونے کو کھوٹا نہیں بنا دیا۔

اور بالکل اسی طرح حق کا باطل سے متصل و قریب ہونا یا باطل کا حق کے جوار و قرب میں رہنا نہ حق کو باطل بنا دیتا ہے نہ باطل کو حق کر سکتا ہے۔ اس جوار و اتصال کے باعث نہ حق کی

حقیقت بدلتی ہے نہ باطل کی ماہیت تبدیل ہوتی ہے۔
حق حق رہتا ہے اور باطل باطل۔

مذکورہ بالا تمام مباحث فلسفہ کے مفاسد و آفات
سے متعلق تھے۔

پانچواں مقالہ

(فرقہ باطنیہ اور اسکی گمراہیاں)

علوم فلسفہ کی تحقیق و تفہیم اور پھر اُن کی تردید و تغلیط سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں نے نتیجۃً یہ معلوم کیا کہ:۔

۱۔ یہ علوم بھی میری غرض و غایت کو پورا نہیں کر سکتے۔

۲۔ عقلِ انسانی تمام مقاصد و مطالب کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس کی مدد سے تمام مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے نہ اُس سے تمام پیچیدگیاں حل ہو سکتی ہیں۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ انھیں ایام میں ایک فرقہ اور بھی حادث و نو پیدا ہوا جس کے متعلق شہرت تھی کہ یہ لوگ

کسی امام معصوم کے قائل ہیں جو ان کے نزدیک حق پر مستقیم ہے اور یہ گروہ اسی امام معصوم سے حقائقِ امور کی معرفت کے حصول کا دعوےٰ کرتا اور کہتا ہے کہ ہمیں ہر چیز کی حقیقت کا علم اُسی امام کے فیض باطنی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اس شہرت کے باعث مجھے بھی یہ شوق جاگا کہ ان کے اقوال کو پرکھوں اور ان کی تحریرات و مقالات سے ان کی اصل حقیقت معلوم کر دوں۔

اور اتفاق دیکھئے کہ انھیں ایام میں مجھے دربارِ خلافت سے یہ حکم پہنچا کہ میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جس میں اس فرقہ باطلہ کے عقائد اور ان کے مذہب کے مفاسد کا واضح بیان ہو۔ اور یہ مجھ سے نہ ہو سکا کہ اس حکم کو ٹال جاؤں۔ بلکہ یہی حکم میری دلی خواہش کا ضمیمہ اور میرے رجحانِ قلبی کا ایک محرکِ خارجی بن گیا۔ اور میں نے اُن کی تحریرات کی تلاش اور اُن کے مقالات کی کنکاش شروع کر دی۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس فرقۂ حادثہ کے بعض شبہات و اعتراضات پہلے ہی میرے علم میں آ چکے تھے۔ اور یہ تمام شبہات ان لوگوں کی شوخیِ طبع کی پیداوار تھے جو نئے نئے اس گروہ میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن یہ شبہات اُن کے پہلوں کی روشِ معہود و طریقِ معلوم سے کچھ جدا گانہ

نوعیت کے تھے۔

غرض میں نے اِن کلمات کو یکجا مرتب کیا اور اُن کے شبہات کی ترتیب و تقریر میں اپنا زورِ قلم بھی آزمایا۔ اور پھر ان کے شبہات کا جواب لکھنا شروع کیا۔ لیکن ہر وقت مجھے بعض علم دوست اصحاب نے تنبیہ کی کہ ان کے اعتراضات و شبہات کی یہ پُر زور اور برجستہ تقریریں اُن کے عقائد باطلہ کی ترویج و تبلیغ کا ذریعہ بنائی جا سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے اعتراضات کو جس زور شور سے آپ پیش کر رہے ہیں، خود اس مذہب کے مقلدین بھی اپنی تقریروں اور تحریروں میں نہیں لا سکتے تو اُن کے مہمل اعتراضات اور لایعنی شبہات کو یوں ترتیب و تحقیق سے بیان کرنا اُن کے مذہب باطل کی تائید کا سامان پیدا کرنا ہے۔

بات معقول تھی اور حق بجانب۔

اس لئے کہ جب حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ معتزلہ کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل اپنی ایک کتاب کی تصنیف میں مشغول تھے تو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اُن پہ بھی اعتراض کیا تھا۔

اس پر حضرت حارث محاسبی نے فرمایا کہ بد مذہبوں کی تردید فرض ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا کہ ہاں بجا فرمایا۔ لیکن آپ کا یہ طرزِ تحریر مجھے پسند نہیں کہ آپ پہلے اعتراضات کی تقریر کرتے ہیں اور پھر ان کے جوابات تحریر فرماتے ہیں۔ کیا آپ کو اس کا یقین ہے کہ جس شخص کی نظر ان اعتراضات پر پڑے گی وہ لامحالہ اُن کے جوابات کی طرف بھی متوجہ ہو گا۔ اور اگر جواب کی طرف توجہ بھی کی تو وہ اُس کی باریکیاں بھی سمجھ لے گا۔

لیکن مسئلہ کی توضیح کے لئے یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالےٰ کا یہ اعتراض بالکل بجا درست ہے۔ لیکن اس کا محل وہ شبہہ و اعتراض ہے جو مخلوق میں مشہور اور زبان زدِ عوام نہ ہوا ہو۔ اس لئے کہ جو اعتراض شہرت پاچکا اُس کا جواب ضروری ہے اور جواب اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اُس شبہہ کی تقریر نہ کی جائے۔

البتہ یہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ مخالفین کے شبہات و اعتراضات کو کسی اہتمام و تکلف کے بغیر نقل کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی جانب سے کوئی ایسا شبہہ یا اعتراض ہرگز نقل نہ کیا جائے جس کا ذکر مخالفین میں نہیں پایا جاتا۔

اور میں نے اس امر کا التزام کیا ہے۔ اور وہ تمام شبہات جنھیں میں نے نقل کیا تھا وہی تھے جو میں نے اپنے ایک دوست کی زبان سے سنے تھے۔ میرا یہ دوست پہلے اسی گروہ میں داخل تھا۔ اور اپنی توبہ کے بعد میرے پاس آتا جاتا رہتا اور اُن کے اعتراضات نقل کیا کرتا تھا۔ اسی نے مجھے یہ بات بتلائی کہ فرقۂ باطنیہ کے افراد جب باہم کوئی مذہبی بحث چھیڑتے ہیں تو اپنے اعتراضات کے دیئے ہوئے بعض جوابات کا مذاق اُڑاتے اور اپنے مخالفین پر ہنستے اور کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنی کم علمی و بے لیاقتی کے باعث ہمارے شبہ اور اعتراض کو سمجھا ہی نہیں تو جواب کیا خاک دیگا۔ اس کے بعد میرا یہی دوست اُن کے اعتراضات کی اصل تقریر نقل کرتا تھا۔

اس لئے میں نے اپنے حق میں یہ پسند نہ کیا کہ وہ میرے جوابات دیکھ کر میرا بھی مذاق اُڑائیں اور اُن جوابات کو نظر میں نہ لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اُن کے اصل اعتراضات کی وہی تقریریں کیں جو اُن کے اصل منشار کے مطابق تھیں اور حتی الامکان میں نے اُنھیں یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ غزالی بھی ہماری بات نہ سمجھ پائے۔

مقصودِ بیان یہ کہ میں نے اُن کے شبہات کو وضاحت

سے نقل کیا اور پھر اُن کے فساد و بطلان پر دلائلِ قاہرہ قائم کئے۔ اور یہ ثابت کیا کہ اُن کے اقوال و مقالات مہمل و لاحاصل ہیں اور ان شبہات کی کوئی واقعی حیثیت نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نادان دوست، نصرتِ اسلام سمجھ کر اُن کے اُن مہملات کے ناقص و نامکمل جوابات نہ دیتے تو اس گروہ کو یہ مقام حاصل نہ ہوتا کہ لوگ اُن کی باتوں پر کان دھریں بالخصوص جب کہ اس تحریک میں کوئی جان ہی نہ تھی اور نہ عوام الناس اُنھیں دھیان میں لاتے تھے۔

لیکن ہمارے ان دوستوں نے شدتِ تعصب سے اس نزاع کو یہاں تک بڑھایا کہ اُن کی ایک ایک بات کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔

مثلاً اگر باطنیہ نے دعوے کیا کہ تعلیم اور معلم کی ہر شخص کو احتیاج ہے تو ان حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کوئی حاجت نہیں۔

اگر باطنیہ نے بیان کیا کہ ہر معلم تعلیم حقیقی کی قابلیت و استعداد نہیں رکھتا۔ بلکہ اس تعلیم کے لئے ایک معصوم معلم کی ضرورت ہے۔ تو ان حضرات کی تمام تر کوششیں اس امر میں صرف ہوئیں کہ معلم معصوم کی ضرورت ثابت نہیں۔

اور اس تعصب کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم و معلم کی ضرورت پر باطنیہ کے دلائل قوی ثابت ہوئے اور اُن کے جوابات ضعیف۔ اور اب کچھ لوگ ان کے دامِ فریب کا شکار ہوگئے اور یہ سمجھنے لگے کہ باطنیہ کا مذہب اپنے اندر ایک قوت و جاذبیت رکھتا ہے اور ان کے مخالفین کا مذہب کمزور و ضعیف ہے۔

حالانکہ انھیں اس پر غور و تامل کی ضرورت تھی کہ یہ جوابات تو اسلام کے نادان دوستوں اور ناواقف مددگاروں کے ہیں۔ جنھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اسلام کے اصول و حقائق کیا ہیں۔؟

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ باطنیہ کے عقائد و مفاسد کی تردید و تغلیط کا بہترین و مؤثر طریقہ یہ تھا کہ ان کے دونوں دعوے یعنی

۱۔ "تعلیم و معلم کی احتیاج" اور

۲۔ "معلم کا معصوم ہونا"

تسلیم کر لئے جاتے اور بعد تسلیم یہ کہا جاتا کہ وہ معلم معصوم، محمد رسول اللہ ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ اب اگر وہ کہتے کہ وہ تو وصال پا چکے تو کہا جاتا تم جس امام کی امامت کا دعویٰ کرتے ہو وہ بھی تو غیر حاضر و غائب ہے۔

اور اگر وہ یہ دعوے کرتے کہ ہمارے اس امام غائب نے اپنے بہت سے جانشینوں اور داعیانِ مذہب کو اطراف و بلادِ عالم میں جابجا مقرر کر دیا ہے۔ اور کہہ دیا ہے کہ جب تمھیں کوئی مشکل درپیش ہو یا تم میں کوئی اختلاف رونما ہو تو واپس آ کر مجھ سے پوچھو اور اپنی مشکل حل کرو۔ میں تمھارا منتظر ہوں۔

تو انھیں جواب دیا جاتا کہ ہمارے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی شریعتِ حقہ کی طرف دعوت دینے اور دین و ملت کی تبلیغ کرنے والوں کو اکنافِ عالم میں پھیلا دیا۔ اور انھیں تربیت و تعلیم میں کامل بنا دیا ہے۔ جس پر قرآن کریم کی یہ گواہی کافی ہے کہ " اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا " یعنی آج میں نے تمھارا دین تمھارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمھارے لئے دین اسلام کو پسند فرما لیا۔

اور تکمیل علوم کے بعد متعلم اور معلم میں اگر انتقال مکانی یعنی موت حائل ہو جائے تو اس سے کوئی نقصان نہیں۔ جیسا کہ تم کہتے ہو کہ امامِ معصوم کا ہم میں موجود نہ ہونا کچھ مضر نہیں۔

باقی رہا ان کا یہ سوال کہ جو مسائل آپ لوگوں نے بصراحت اپنے نبی سے نہیں سنے اور درحقیقت بہت سے

ایسے مسائل ہیں جن کا جواب صراحتہً احادیث میں نہیں پایا جاتا تو اُن کے بارے میں اگر تم اپنے اجتہاد و قیاس سے کام لیتے اور اُن مسائل کا حل تلاش کرتے ہو تو اس میں غلطی کا امکان ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم اپنے اجتہاد و قیاس سے جواب معلوم کرنے میں غلطی کر بیٹھو اور پھر اُسی غلطی میں مبتلا رہو۔

تو اس کا جواب یوں دیا جائے گا کہ ایسی حالت میں ہم وہی کریں گے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کیا۔ یعنی جب اُنھیں حضور نبیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف تبلیغ دینِ متین کے لئے بھیجا تو جن امور میں صراحتہً وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل رکھتے تھے اُس کی تعمیل کرتے۔ اور جن مسائل میں کوئی صریح حکم آپ کے علم میں نہ تھا اُن میں اجتہاد سے کام لیا۔

اور اس امر کا یہ باطنیہ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ دُور دراز ممالک میں جب کوئی ایسا ہی مشکل امر انھیں درپیش ہوتا ہے تو وہ اپنی رائے اور قیاس سے اُس مشکل کو حل کرتے اور اس مسئلہ کا جواب معلوم کر لیتے ہیں۔

اور بات دراصل یہ ہے کہ صریح احکام تو محدود و معدود ہوتے ہیں اور معاملات و حادثات غیر محدود و لاتعداد۔ تو دور دراز اطراف عالم سے دشوار گذار راہیں

طے کرتے ہوئے اپنے امام تک پہنچنا اور پھر فوراً پلٹ جانا اگر امر محال نہیں تو سخت دشوار اور ناقابلِ تعمیل ضرور ہے۔

بلکہ ممکن ہے کہ اس آمد و رفت کے دوران وہ سوال کرنے والا اس دنیا ہی سے رخصت ہو جائے تو اس قائم مقام امام کی واپسی عبث و بیکار ثابت ہو گی۔

مثلاً اگر کسی شخص کو سمتِ قبلہ میں شک پڑ جائے، کہ نامعلوم قبلہ کدھر ہے تو اس مشکل کی دریافت کے لئے اگر وہ اُسی امام کے پاس پہنچنا اور اُسی سے قبلہ کی صحیح سمت معلوم کرنا چاہے تو ظاہر ہے کہ وہ نماز اپنے وقت پر ادا نہ کر سکے گا۔ لہٰذا ایسے شخص کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ اپنے اجتہاد و رائے سے (جسے اصطلاح شرع میں تحری کہا جاتا ہے) نماز ادا کرے۔ اور اُس کی یہ نماز اب جائز و درست ہو گی اگرچہ غیر سمتِ قبلہ پڑھی گئی ہو۔ اس لئے کہ نماز پڑھنا ضروری و فرض ہے اگر تحری نہ کرے تو کیا کرے۔

پھر ہمارے نبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ اہلِ اجتہاد اگر اپنے اجتہاد میں خطا[ع۱] کرے تو

ع۱ خطا دو قسم پر ہے خطائے عنادی اور خطائے اجتہادی (باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

اُس کے لئے ایک ثواب ہے۔ اور اُس کا اجتہاد صحیح ہو تو دوگنا ثواب پائے۔ غرض قابل اجتہاد مسائل میں ہمارا جواب یہی ہوگا۔

یوں ہی کسی فقیر پہ مال زکوٰۃ صرف کرنا ہے ـــ زکواۃ دینے والے نے ایک شخص کو فقیر اور زکواۃ کا مصرف سمجھ کر مالِ زکواۃ دے دیا۔ اور درحقیقت وہ شخص صاحب نصاب تھا زکوٰۃ کا مصرف نہ تھا۔ لیکن اس صورت میں زکواۃ ادا کرنے والے پہ نہ کوئی شرعی مواخذہ ہے نہ ادائے زکواۃ میں کوئی شبہہ۔ اگرچہ اُس نے اپنے اجتہاد میں یہ غلطی کی

(حاشیہ صفحہ ۱۰۶) خطاءِ عنادی یہ مجتہد کی شان نہیں۔ اور خطاءِ اجتہادی یہ مجتہد سے ہوتی ہے اور اس میں اُس پہ عند اللہ اصلاً مواخذہ نہیں۔

مگر احکامِ دنیا میں وہ دو قسم پہ ہے۔ خطاءِ مقرّر اور اور دوسری خطاءِ منکر۔ خطاءِ مقرّر یہ وہ خطائے اجتہادی ہے جس سے دین میں کوئی فتنہ نہ پیدا ہوتا ہو اس لئے اس کے صاحب پہ انکار نہ ہوگا جیسے ہمارے نزدیک مقتدی کا امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا۔

اور خطاءِ منکر وہ خطاءِ اجتہادی ہے جس کے (باقی صفحہ ۱۰۸ پر)

کہ غنی کو فقیر تصور کیا۔ لیکن چونکہ اس نے بمقتضائے ظن ایسا کیا ہے۔ لہٰذا مواخذہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس پر اگر وہ یہ کہیں کہ ایک کا گمان دوسرے کے برخلاف ہو سکتا ہے (تو ایک ہی مسئلہ کی باہم دو خلاف صورتیں ہو گئیں ان میں سے کسے درست کہا جائیگا)

تو ہم جواب دیں گے کہ ہر شخص کو ایسی صورت میں اپنے ہی ظن کے مطابق عمل بجا لانے کا حکم ہے۔ اگرچہ ایک کا ظن دوسرے کے برخلاف ہو۔ جیسا کہ امر قبلہ میں ہوتا ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ مقلدین یعنی ائمہ اربعہ میں سے کسی امام معین کی تقلید کرنے والے تو اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے۔ نہ وہ اپنے ظن کے مطابق عمل کرتے ہیں بلکہ ان میں کوئی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتا ہے کوئی امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیروی۔ وعلیٰ ہٰذا۔

تو اسے جواب دیا جائے گا کہ مثلاً جب کسی شخص پر سمت قبلہ مشتبہ ہو جائے۔ اور وہ دو شخصوں سے اس کے

(حاشیہ صفحہ ۱۰۷) صاحب پر انکار کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی خطا باعث فتنہ ہے۔ (بہار شریعت) مترجم عفی عنہ

مقلدین ہمارا ... رحمۃ اللہ

متعلق دریافت کرے اور ان دونوں میں سے ہر ایک قبلہ کی سمت علیٰحدہ علیٰحدہ بتائے تو اب بتائیے کہ یہ بیچارا سوا اس کے کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی عقل و فراست سے یہ معلوم کرے کہ ان دونوں میں سے کس کی معلومات وسیع ہیں اور قرین قیاس کس کی رائے ہے۔ اور اب اس کی رائے میں جو اعلم و افضل ہو اُسی کا اتباع کرے اور اُسی کی بتائی ہوئی سمت کو قبلۂ نماز سمجھ کر اپنی نماز طمانیت قلب سے ادا کرے۔

اسی طرح مذاہب میں تقلید کا حال ہے یعنی مخلوق کو سب سے پہلے اجتہادِ انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمۂ مجتہدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حاجت ہے اگرچہ مخلوق کو اس کا بھی علم ہے کہ مجتہد سے اپنے اجتہاد میں کبھی خطا بھی سرزد ہو جاتی ہے

بلکہ حضور اقدس صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں ظاہر[ع] احوال پر حکم دیتا ہوں اور اسرارِ باطن کو

ع۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی، بہرحال دنیاوی فیصلے علم غیب کی بنا پر نہیں روئداد مقدمہ ہی کی بنا پہ صادر ہونگے (باقی صفحہ ۱۱۰ پر)

اللہ تعالےٰ کے علم پر چھوڑتا ہوں۔ یعنی میں ظن غالب پر حکم دیتا اور فیصلہ کرتا ہوں (اگرچہ رب عزوجل نے مجھے اسرار باطن پر بھی مطلع فرمایا ہے) اور گواہوں کی گواہی سے جو امر ثابت ہوتا ہے اُس میں خطا اور غلطی کا بھی امکان ہے۔ اور جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد فرما رہے ہیں تو دوسرے دل

(حاشیہ صفحہ ۱۰۹) اور ان میں مدعی و مدعا علیہ کی جانب سے غلطی لغزش، ناانصافی دھوکہ دہی کا احتمال ہر وقت ہے۔ اس لئے حکام کا فیصلہ خواہ کچھ ہو لیکن جو حق ہے وہ عند اللہ حق ہی رہے گا۔ اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے یہاں ناحق ہی شمار ہوگا۔ قاضی کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے۔ اصل شے انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود اس کا ضمیر اور تقویٰ ہے تو جو لوگ اپنی چرب زبانی یا سخن سازی یا اپنے اثر و پیروی سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں اُنھیں اور زیادہ ڈرنا چاہیئے کہ اُن پر علاوہ دوسرے جرائم اور فریق ثانی کی حق تلفی کے ایک مزید جرم حاکم عدالت کو فریب میں مبتلا کرنے کا بھی ہوگا۔ اگرچہ انبیاء کرام کسی فریب میں مبتلا نہیں کئے جا سکتے۔ اُن پر حقیقت حال روشن ہوتی ہے۔ اُن پر بکرمہ تعالیٰ غیب کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور دلوں کے اسرار پر بعطاء الٰہی اُنھیں واقفیت ہوتی ہے۔ ۱۲ مترجم عفی عنہ

کس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اجتہادات مسائلِ اجتہادیہ میں خطا و غلطی سے محفوظ و مامون ہیں۔

اس فرقہ کے متبعین یہاں دو سوال اور بھی کرتے ہیں۔

سوال اول

یہ کہ آپ کا یہ حیلہ مسائلِ اجتہادیہ میں تو کام آسکتا ہے لیکن قواعد عقائد میں مخطی و خطا کار مجتہد کو معذور و قابلِ معافی نہیں کہا جاسکتا۔ تو معتقدات میں اختلاف رونما ہو تو آپ کس راستہ کو اختیار کریں گے۔

اور اس کا جواب بآسانی یہ دیا جاسکتا ہے کہ تمام عقائد کے قواعد و اصول قرآن کریم اور حدیث شریف میں موجود ہیں۔ اب رہی ان قواعد و اصول کی تفصیل و تشریح تو اس میں بے شک اختلاف و تنازع رونما ہو سکتا ہے لیکن ان امور متنازع فیہا میں حق و باطل کی تمیز و شناخت "قسطاس" یعنی میزان مستقیم میں وزن کے بعد حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور اس میزان عدل کے اوزان (باٹ) وہی ہیں جو قرآن کریم میں ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ گنتی میں یہ پانچ چیزیں ہیں جن پر میں نے اپنے رسالہ "قسطاس عــہ المستقیم" میں تفصیلی

عــہ۔ اسی قسطاس مستقیم میں امام صاحب ایک جگہ (باقی صفحہ ۱۱۲ پر)

نگاہ ڈالی ہے۔

اس پر اگر وہ کہنے لگیں کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا مقابل و مخالف آپ کی اس قسطاس (یعنی ترازو) کو تسلیم نہ کرے اور کہے کہ یہ تو آپ کی تراشیدہ ہے۔

تو میں اس کے جواب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فرقۂ باطنیہ کی طرح کوئی مدعیِ اسلام اس ترازو کو سمجھنے کی کوشش کرے تو یہ بات تصور ہی میں نہیں آسکتی کہ وہ اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اساس و بنیاد قرآن کریم ہے۔ اور یہ میزان اسی بنیاد پر قائم ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۱۱) ارشاد فرماتے ہیں:۔

"خدائے تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" (یعنی لوگوں کو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و نصیحت کے ذریعے بلائیے اور اُن سے بہترین طور پر بحث کیجئے۔)

جاننا چاہئے کہ حکمت کے ذریعہ جو لوگ بلائے جاتے ہیں وہ اور ہیں، نصیحت کے ذریعہ سے اور، بحث کے ذریعے سے اور۔ اب اگر حکمت اُن لوگوں کے لئے استعمال کی جائے جو نصیحت کے مخاطب ہیں تو اُنھیں نقصان پہنچے گا جس طرح (باقی صفحہ ۱۱۳ پر)

بلکہ اس میزان کا انکار منطقیوں کی جانب سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ وہ منطقی شرائط کے مطابق وموافق ہے۔ نیز متکلمین بھی اس کا انکار نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ ثبوت مطلوب واثبات حق کیلئے جو دلائل وہ علم کلام میں قائم کرتے ہیں یہ میزان اس سے جداگانہ کوئی شئے جدید نہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب آپ نے اس قسم کی ایک میزان قائم کرلی ہے تو مخلوق کے باہمی افتراق واختلاف کے دفعیہ کی آپ کوشش کیوں نہیں کرتے۔

تو میں کہوں گا کہ اگر باہمی اختلاف رکھنے والے

(حاشیہ صفحہ ۱۱۲) شیر خوار بچہ کو پرند کا گوشت نقصان کرتا ہے۔ اسی اسی طرح اگر مجادلہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا جائے جو حکمت کے اہل ہیں تو اُن کو نفرت ہوگی۔ جیسے قوی آدمی کو عورت کا دُودھ پلایا جائے تو پی نہ سکے گا۔ اور مجادلہ ومباحثہ اگر لبطرز معقول نہ کیا جائے تو اس کی یہ مثال ہوگی کہ ایک بدوی کو گیہوں کا آٹا کھلایا جائے۔ حالانکہ اُسے صرف کھجور کھانے کی عادت ہے۔ اور یہ وہ باریک باتیں ہیں جو صرف اُس نور سے حاصل ہوتی ہیں جو مقام نبوت سے حاصل کیا گیا ہے ۱۲ مترجم عفی عنہ

میری طرف متوجہ ہوں اور میری باتوں پر کان دھریں، تو میں اُن سے اس خلاف کو دور کر دوں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ لوگ اپنے معتقدات کے خلاف کچھ سننا پسند ہی نہیں کرتے۔

یہ میرا دعوےٰ نہیں آپ خود میری اُس کتاب کو اُٹھائیے، مطالعہ کیجئے غور و تامل سے کام لیجئے۔ میں نے اختلافات کے دفع کرنے کا وہاں جو طریقہ بیان کیا ہے تو آپ پر خود ہی حق واضح ہو جائے گا۔ اور آپ پر روشن ہوگا کہ واقعی ان تمام اختلافات کو ختم کر دینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ولیکن شرط وہی ہے کہ لوگ اُس کی جانب متوجہ ہو کر اس پر کان لگائیں۔ اور یہی کار دشوار ہے۔ ہاں جنھیں توفیقِ ایزدی نے سہارا دیا ہے انھوں نے اس قسطاس مستقیم کے باعث ساحلِ مراد کو بھی پا لیا۔

پھر یہ لوگ جنھیں اپنا پیش رو و مقتدا بناتے ہیں اُن کا تو دعوےٰ تھا کہ لوگ سنیں یا نہ سنیں ہم اُن سے حق منوالیں گے اور باہمی اختلافات کو دفع کر دیں گے۔ لیکن اس کا انجام و نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی اختلافات و افتراقات ہنوز باقی ہیں، جو پہلے موجود تھے۔ تو اس قسم کے دعوؤں کی حقیقت لن ترانی و لفاظی سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔

خود امام الائمہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اہلِ اسلام و مدعیانِ اسلام (یعنی خوارج) سے اس اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن جب مخالفین اپنی ضد پر اڑے رہے تو ظاہر ہے کہ کامیابی کی کیا امید ہو سکتی تھی۔

اور اس سے بڑھ کر مزیدار بات یہ ہے کہ باطنیہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ ہمارے امام کو اس پر قدرت ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا کلام سننے پر مجبور کر دے اور لوگ اس کی بات سننے پر مجبور ہو جائیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ دعویٰ کس دن کے لئے اٹھا رکھا ہے۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ اُن کے اِن مصنوعی اماموں کے جتنے دعاوی اور لن ترانیاں مخلوق میں مشہور ہوئیں اتنا ہی اختلاف بڑھتا گیا۔ اور مخالفین میں زیادتی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس اختلاف نے لوگوں کے دلوں میں یہ خوف پیدا کر دیا کہ کہیں ملک میں خونریزی نہ ہو جائے جس کے نتیجہ میں ملک برباد ہو۔ بچے یتیم ہوں۔ راہزن پیدا ہوں اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

غرض یہ کہ آپ کے اس مفروضہ امام نے مخلوق سے اختلاف رفع کرنا درکنار، اُن میں اپنے بلند دعووں

اور لن ترانیوں کی برکت سے وہ اختلافات پیدا کر دیئے جو اس سے پہلے کسی زمانے میں بن پائے گئے تھے۔

سوال دوم

اس فرقۂ باطنیہ کا یہ ہے کہ آپ بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ میں مخلوق کا باہمی خلاف دفع کر سکتا ہوں۔ لیکن جو شخص ان جداگانہ مذاہب و مختلف طرق کو دیکھ کر حیرت زدہ ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں کس مذہب کو اختیار کروں وہ طلب حق کے لئے آپ ہی کے پاس آئے یہ کوئی لازمی امر نہیں خصوصاً جب کہ آپ سے خلاف رکھنے والے بھی اس سرزمین پر موجود ہیں۔ اور وہ آپ میں اور اُن میں اپنے نزدیک کوئی فرق نہیں کرتا تو ہو سکتا ہے کہ آپ کے پاس آنے کی بجائے وہ آپ کے مخالفین کے پاس پہنچے۔

اس کے جواب میں یوں کہا جائے گا کہ بعینہٖ یہی سوال ہم آپ سے کرتے ہیں کہ اگر وہ متحیر شخص آپ کی طلب پر آپ کے پاس طلب ہدایت کے لئے آئے اور آپ سے یہ کہے کہ آپ میں وہ کون سی خوبی ہے کہ جس کی بنا پر آپ کی بات مانی جائے جب کہ اکثر اہل علم

وحق پسند حضرات آپ سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔

اب ہمیں بتایا جائے کہ اس شخص کو آپ کیا جواب دیں گے ۔؟

اگر آپ کہیں کہ ہمارے امام کے معصوم ہونے پر نص صریح وارد ہے تو آپ کا مخالف ومقابل اُسے کیوں تسلیم کرنے لگا اِس لئے کہ اُسے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نص صریح نہیں پہنچی۔ بلکہ برخلاف اس کے اس نے لوگوں میں یہ چرچا سُنا کہ فرقۂ باطنیہ بہت سی باتیں اپنی طبیعت سے گڑھ کر بیان کرتا ہے۔

پھر قطع نظر اس امر کے میں ایک بات اور بھی کہتا ہوں کہ فرض کر لیجئے اُسے آپ کی پیش کردہ نص میں کوئی تامل وتردد نہیں۔ لیکن ایسا شخص اگر اصلِ نبوت ہی میں متحیر و مذبذب ہے تو کیا تمھارا امام جسے تم معصوم فرض کر رہے ہو حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرح کوئی معجزہ پیش کرے گا۔ اور یہ کہے گا کہ میری صداقت اور حقانیت پر یہ دلیل ہے کہ میں تیرے مردہ باپ کو زندہ کئے دیتا ہوں۔ اور وہ میری صداقت پر گواہی دے گا۔ اور مان لیجئے کہ اُس نے ایسا کر بھی دیا اور اُس شخص کے مردہ باپ نے زندہ ہو کر اس امر کی

گواہی بھی دے دی کہ بے شک یہ امام اپنی دعوت میں سچا اور اس کا مذہب حق ہے تو کیا اس پر یقین کلی ہے کہ وہ شخص اپنے باپ کی بات پر ایمان لے ہی آئے گا جبکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس قسم کے معجزے دیکھ کر بھی لوگ آپ پر ایمان نہ لائے۔ اور آپ کی دعوت حقہ کو قبول نہ کیا اور آپ کو نبی برحق نہ مانا۔

بلکہ اس مفروضہ امام کے اس فرضی استدراج پر کچھ عقلی مباحث دقیقہ وسوالات مشکلہ وارد ہوتے ہیں جنھیں ہم اس لئے پیش نہیں کرتے کہ آپ کو عقلی مباحث پر وثوق نہیں اور معجزہ^ع کی صداقت اُسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب معجزہ اور جادو میں فرق کیا جائے۔ اور یہ فرق اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو لے کہ اللہ تعالے اپنے بندوں کا گمراہی میں پڑا رہنا پسند نہیں فرماتا۔

ع نبی کے دعوائے نبوت میں سچے ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ نبی اپنے صدق کا علانیہ دعویٰ فرماکر محالاتِ عادیہ کے ظاہر کرنے کا ذمہ لیتا اور منکروں کو اس کے مثل کی طرف بلاتا ہے اللہ عزوجل اُس کے دعوے کے مطابق امر محال عادی ظاہر فرما دیتا ہے۔ اور منکرین سب عاجز رہتے ہیں۔ اسی کو معجزہ (باقی صفحہ ۱۱۹ پر)

ظاہر ہے کہ یہ مباحث دقیق مباحث ہیں اور ان کا حل دشوار ہے۔

غرض سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ مباحث کس طرح طے پائیں۔ بالخصوص جبکہ آپ کا وہ فرضی امام مخالفین کی بہ نسبت مزید استحقاق اتباع بھی نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُنھیں مباحث عقلیہ کی طرف رجوع ہونا پڑے گا جس کے آپ لوگ منکر ہیں۔ اور یہاں یہ بات نہ بھولئے کہ ان مباحث میں آپ کے مخالفین اپنے مذہب کی تائید میں بہ کثرت

(حاشیہ صفحہ ۱۱۸) کہتے ہیں۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کا ناقہ۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کے عصا کا سانپ ہوجانا اور ید بیضا۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مردوں کو جلانا اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا۔ اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے تو بہت ہیں۔

معجزے میں قلب ماہیت ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جو قلب ماہیت کو محال کہتے ہیں، اُن کے نزدیک معجزے میں پہلی حقیقت فنا ہوجاتی ہے اور دوسری حقیقت رب العزۃ پیدا فرما دیتا ہے تو معجزہ میں تبدیلی حقیقت نہ ہوئی بلکہ تجدید ماہیت ہوئی۔ اور جو ممکن مانتے ہیں (باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

واضح دلیلیں پیش کریں گے جن کا جواب دینا آپ پر ضروری ہوگا۔

اور اُن کے سوال کے جواب میں یہ دوسری شق اُن پر کچھ ایسی پلٹتی ہے کہ اس کا جواب ان کے اگلوں پچھلوں سے بن نہیں پڑ سکتا۔ اگرچہ وہ اکٹھے سر جوڑ کر بیٹھیں، اور اُس کا حل تلاش کریں۔

دراصل ہمارے مناظرین سے یہاں ایک چوک ہو گئی اور وہ یہ کہ اس فرقہ کی جانب سے جب یہ سوال ان پر وارد کیا گیا تو الزامی جواب دینے کی بجائے ان حضرات نے تحقیقی اور طول طویل جوابات دیئے جن کا سمجھنا بھی ان جیسے لوگوں کے لئے دشوار تھا۔ اور سمجھ بھی لیتے تو خاموش نہ ہوتے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۱۹) وہ کہتے ہیں کہ معجزہ میں قلب حقیقت ہوتا ہے۔ لیکن اِس پر سب کا اتفاق ہے کہ معجزہ واقعی ہوتا ہے برخلاف سحر کہ اس میں اصل شے بالکل متغیر نہیں ہوتی۔ سحرۂ فرعون کے بارے میں فرمایا جاتا ہے "سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ" لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں ڈرا دیا۔ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ان کے سحر سے یہ بات پیدا ہو گئی (باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

اب اگر کوئی اور بندۂ خدا یہ سوال کرے کہ الزامی جواب نے اگرچہ مخالف و مقابل کا منہ بند کر دیا۔ لیکن آپ پر جو اعتراض وارد ہوا تھا وہ جہاں اُن پر قائم رہا وہاں آپ پر بھی تو باقی رہا۔ تو پھر اس کا کوئی تحقیقی اور واقعی جواب بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کیا؟

تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہاں تحقیقی اور شافی جواب بھی موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی متحیر اور حق کا متلاشی یہ کہے کہ مجھے حیرت ہے۔ اور یہ نہ بتائے کہ اُسے کس امر میں حیرت ہے۔ یعنی اس امر کو متعین نہ کرے جس میں وہ متحیر ہے تو اُس سے کہا جائے گا کہ تیری مثال اُس مریض کی سی ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں مریض ہوں۔ لیکن اپنے مرض کی تعیین نہیں کرتا کہ اُسے کون سا مرض لاحق ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے علاج کا خواہشمند ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے مریض مطلق کا تو کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ ہاں، جب اُس کے مرض کی تشخیص ہو جائے اور وہ بتا دے کہ مثلاً مجھے دردِ سر یا اسہال وغیرہ کا عارضہ ہے تو البتہ اُس کی طرف توجہ کی جائے گی۔

(حاشیہ صفحہ ۱۲۰) کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑتی ہیں ۱۲ مترجم عفی عنہ

بس یوں ہی سمجھ لیجئے کہ جو شخص امرِ حق میں متحیر ہے جب تک وہ اس مسئلہ کو متعین نہ کرے گا جس میں وہ متحیر و پریشان ہے اُس کو تسلی نہیں کی جا سکتی۔ ہاں، جب وہ مسئلہ کو متعین کر دے گا تو پھر اس میں حق و باطل کی تمیز کے لئے وہی میزان کام میں لائی جائے گی جس کا ذکر اوپر مذکور ہوا۔

یہی وہ میزان ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص اس اعتراف پر مجبور ہے کہ واقعی یہ میزان حق کی میزان ہے۔ اور اس کے وزن پر پورا پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میزان سے خود اس میزان کی حقانیت و صداقت کا علم و یقین بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اسی سے دوسرے اوزان کی حقیقت و صحت کا بھی علم حاصل ہو سکتا ہے۔

بالکل یوں ہی جیسے کوئی حساب و ہندسہ کا طالب اسی علم کے ذریعہ خود اس علم کی صحت و درستی کو بھی دریافت کر لیتا ہے۔ اور معلم کی علمی قابلیت اور صداقت کو بھی معلوم کر لیتا ہے۔ میں نے ان مباحث کو اپنی کتاب "قسطاس" میں تقریباً بیس صفحات بوضاحت بیان کیا ہے۔ شوق ہو تو وہیں دیکھئے۔

میں یہاں یہ امر واضح کرتا چلوں کہ اس مختصر کتاب میں فرقۂ باطنیہ کی تردید میرا اصل مقصود و نصب العین نہیں کہ اس بیان سے میں پہلے ہی فارغ ہو چکا ہوں۔ اس سلسلہ میں میری پہلی کتاب

مستظہری" ہے۔

دوسری کتاب "حجۃ الحق" ہے۔

ان دونوں کتابوں میں میں نے اُن سوالات کے جوابات دیئے ہیں جو بغداد شریف میں میرے سامنے پیش کئے گئے۔

تیسری کتاب "مفصل الخلاف" ہے۔ جس میں بارہ ۱۲ فصلیں ہیں۔

اور اس کتاب میں اُن سوالات کے جوابات ہیں جو ہمدان میں مجھ پر وارد کئے گئے۔

چوتھی کتاب "الدرج" ہے۔

اس میں مختلف جدولیں اور خاکے بھی ہیں اور اُن سوالات کے مختصر جوابات بھی جو طوس میں میرے پاس نقل کئے گئے۔

پانچویں کتاب "قسطاس المستقیم" ہے جس کا مقصود خاص جملہ علوم کی میزان بیان کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ ہر زمانہ میں کسی امام معصوم کا پایا جانا ضروری ہے نہ اس کی کچھ حاجت۔

یہاں میرا اصل مقصود یہ ثابت وظاہر کرنا ہے کہ فرقۂ باطنیہ کے پاس ظلمتوں اور تاریکیوں سے نجات دینے والی کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہ اپنے امام کی تعیین وخصوصیت پر بھی

کوئی دلیل نہیں رکھتے۔

باایں ہمہ ہم نے اُنھیں بارہا آزمایا۔ ہم نے ان کے اس قول کی تصدیق بھی کی کہ علم کی حاجت ہے۔ اور بر سبیلِ فرض یہ بھی مانا کہ اس تعلیم کے لئے ایک معلم معصوم کی ضرورت ہے یہاں تک کہ ہم نے ان کے زعم کے مطابق ایک امام معین کا وجود بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جب ہم نے اُن سے یہ سوال کیا کہ تم ہمیں ان علوم کا پتہ دو جو تم نے اپنے امام مفروض سے حاصل کئے ہیں۔ اور اسی سلسلہ میں اُن پر دوسرے اعتراضات کئے تو وہ اُنھیں سمجھ بھی نہ سکے چہ جائیکہ اس کا جواب دے سکتے۔ اور عاجزانہ طور پر اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے بات یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ہم ان اعتراضات کا جواب اپنے امام سے معلوم کر کے دیں گے اور اس کی خاطر ہم سفر پر نکلیں گے۔

تعجب تو اس پر ہے کہ انھوں نے اپنی عمریں تلاش معلم میں ضائع کیں۔ بلکہ اس پر اظہار مسرت بھی کیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کورے کے کورے رہے۔

ان کی مثال بالکل وہی ہوئی کہ ایک شخص نجاست میں آلودہ ہو جائے اور پانی کی تلاش میں مارا مارا پھرے۔ لیکن جب وہ پانی تک پہنچ جائے تو اب خوشی میں بھول کر نجاست دور کرنا بھول جائے اور ناپاک کا ناپاک ہی رہے۔

اس فرقۂ باطنیہ میں جو لوگ مدعیانِ علم میں سے تھے جب ہم نے اُن کا تجزیہ کیا تو ہم بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے تمام علوم کا ماخذ فیثاغورس کا فلسفہ ہے جس کا شمار متقدمین فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مذہب تمام فلاسفہ کے مذاہب سے زیادہ پوچ ہے جس کی تردید حکیم ارسطاطالیس نے بھی کی ہے بلکہ اس کی معلومات کو رکیک بتایا۔ اور بہ نظرِ حقارت دیکھا ہے۔ جس کا ذکر رسالۂ "اخوان الصفا" میں موجود ہے۔

بہرحال یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کی تمام معلومات مذہب فلسفہ کے وہ مسائل ہیں جنھیں حشو وزوائدِ فلسفہ یا بھرتی کے مسائل کہا جا سکتا ہے۔

غرض یہ کہ یہ امر کتنا تعجب خیز ہے کہ ایک شخص اپنی تمام عمر تحصیل علم کیلئے گنوا دے اور اُسے اس قسم کی ضعیف ولا یعنی معلومات کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ اور لطف یہ کہ انھیں پر اعتماد کر بیٹھے اور اس گمانِ فاسد میں مبتلا رہے کہ ہم تو علم کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچ چکے۔

اب سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ تجربے ومشاہدے سے ہم نے اُن کے ظاہر و باطن سے یہی اخذ کیا کہ یہ لوگ اپنے کردار و گفتار، اقوال واحوال سے سادہ لوح عوام کو دھوکا دیتے ہیں کہ تمہارا مذہب درست نہیں۔ تم تعلیم کے محتاج ہو

مجھیں ایک معلم کی ضرورت ہے۔ عوام بیچارے غفلت کے مارے اگر انھیں کچھ جواب دیتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں تمھارے علم کی ضرورت نہیں۔ تو وہ ضرورت علم اور معلم پر دلیلیں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان ناواقفوں کو قائل ہونا پڑتا ہے۔

اب اگر کوئی خدا کا بندہ اُن سے یہ کہے اچھا ہم علم اور معلم کی حاجت تو تسلیم کرتے ہیں۔ اور آپ نے چونکہ اُسی معلم سے تعلیم پائی ہے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دے رہے ہیں تو پھر اُس کی تعلیم دی ہوئی کچھ باتیں ہمیں بھی بتائیے۔

تو اس وقت وہ یہ کہہ کر چھوٹ جاتے ہیں کہ جب علم اور معلم کی ضرورت تمھیں تسلیم ہے تو اس علم اور معلم کی تلاش میں رہو۔ ہمارا جتنا کام تھا وہ ہم نے کر دیا۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔"

اس لئے کہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اگر اب زبان ہلائی تو ساری قلعی کھل جائے گی اور کئے دھرے پہ پانی پڑ جائے گا اس لئے کہیں معمولی سے معمولی مسئلہ کا جواب دینا درکنار تو وہ اشکال و اعتراض ہی ان کی سمجھ سے باہر ہوگا۔ (پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل)

فرقۂ باطنیہ کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا یہ بلا کم و کاست اُن کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ اگر تمھیں ان سے واسطہ پڑتا تو بات کرنا بھی گوارا نہ کرتے نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اُنھیں پرکھ لیا تو اپنا دامن اُن سے بچالیا۔

چھٹا مقالہ

صوفیائے کرام کے مسلک کے بیان میں

پھر جب میں نے ان تمام علوم کی تحصیل و تحقیق سے فراغت پائی تو مجھے یہ ہمت ہوئی کہ میں نے اپنی تمام تر توجہ حضرات صوفیائے کرام قدست اسرارہم کے علوم و مسلک کی طرف پھیرنے کی ہمت کی۔ اور مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ :-

۱۔ علمِ تصوف میں علم بھی ہے اور عمل بھی۔ اور یہ دونوں زبان کو کامل بناتے ہیں۔

؏ امام قشیری اپنے مشہور رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ (باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

۲۔ ان کے علم کا نتیجہ یہ ہے کہ نفس کے تمام مکائد روشن ہو جاتے ہیں۔

(۳) نفس اخلاق مذمومہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

(۴) فضائل محمودہ و خصائلِ حمیدہ اُس کے قلب کو آراستہ و پیراستہ کر دیتے ہیں۔

(۵) انسان کا قلب ماسوی اللہ سے خالی ہو کر ذکرِ الٰہی سے منور رہتا ہے۔

اور چونکہ ان کے علوم کا حاصل کرنا عمل کے مقابلہ میں سہل الحصول اور آسان ہے۔ اس لئے میں نے ان علوم کی تحصیل کی نیت سے ان حضرات کی چند مشہور کتابوں کا مطالعہ

(حاشیہ صفحہ ۱۲۹) حضور اقدس صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ واصحابہ و بارک وسلم کے زمانِ برکت نشان میں "صحابہ" یا "اصحاب" کے لقب کے سوا کسی اور لقب کا نام ونشان نہ تھا۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے بڑھ کر اور کون سا شرف تصور و وہم میں آسکتا تھا کہ وہ ایجاد ہوتا۔

صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے بعد تابعین اور تابعین کے بعد تبع تابعین کا لقب اہلِ اسلام میں ایجاد ہوا۔ یہ زمانہ بھی گذر گیا (باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

شروع کیا۔ مثلاً "قوت القلوب" مصنفہ حضرت ابوطالب مکی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ، اور حضرت امام حارث محاسبی۔ سید الطائفہ سیدنا جنید بغدادی۔ حضرت امام ابوبکر شبلی اور حضرت بایزید بسطامی و دیگر مشائخ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی تصنیفات۔

اس مطالعہ سے مجھے علم سلوک و تصوف کی کنہ و حقیقت معلوم و مفہوم ہوئی۔ اور میں نے ان کے مقاصدِ علوم کا جائزہ لیا اور اس میں مجھے اس قدر انہماک و شغف رہا کہ تعلم و سماع کے ذریعہ جس قدر اِن علوم کو حاصل کرنا ممکن ہے میں نے حاصل کر لیا۔

لیکن مجھے یہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی

(حاشیہ صفحہ ۱۳۰) تو بزرگانِ ملت زاہد و عابد کے نام و لقب سے موسوم و ملقب ہوئے لیکن زہد و عبادت کا دعویٰ عام ہو چکا تھا یہاں تک کہ اہلِ بدعت بھی اس کے مدعی بننے لگے۔

اس لئے جو لوگ خاص اہلِ سنت و جماعت میں سے زہد و ریاضت میں مشغول ہوئے وہ صوفی کہلائے۔ اور یہ لقب دوسری صدی ہجری کے اختتام سے پہلے رواج پا گیا۔ (رسالہ قشیریہ) مترجم عفی عنہ

کہ سلوک و تصوف کے اسرار و نکات کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ذوق و وجدان، صدقِ حال اور تبدیلی صفات کی حاجت ہے۔

بطور تمثیل اسے یوں سمجھئے کہ اگر کسی شخص کو صحت و شکم سیری کی تعریف معلوم ہو جائے، بلکہ وہ ان کے اسباب و شرائط بھی معلوم کر لے تو محض اس علم کی بدولت اُسے صحیح و تندرست اور شکم سیر نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں فرقِ عظیم ہے۔

و علیٰ ہٰذا کسی شخص کو یہ معلوم ہے کہ نشہ اُس کیفیت کا نام ہے جو معدہ سے دماغ کی طرف بخارات کے بڑھنے اور عقل و فکر پر حاوی و غالب ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے اور اُس کے بالمقابل وہ شخص ہے جو نشہ میں چور ہے۔ لیکن نشہ کی تعریف اور اس کے اسباب سے واقف نہیں اور اس کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

اب کون نہیں جانتا کہ ان دونوں میں بین فرق ہے۔

اور سنئے حکیم و طبیب حالتِ مرض میں صحت و تندرستی کی تعریف اور اس کے اسباب سے واقف ہوتا ہے لیکن وہ تندرست و صحیح نہیں۔

اسی طرح زہد و ترک دنیا کی حقیقت اُس کے اسباب

وشرائط جان لینے کا نام زہد و ترک دنیا نہیں، نہ ایسا شخص زاہد و تارک الدنیا کہلانے کا مستحق۔ اور نہ اُس کے نفس کو ترکِ دنیا و گوشہ نشینی کی لذتیں معلوم۔

قصہ کوتاہ جب مجھے یقینی طور پر اس کا علم ہو گیا کہ حضرات صوفیائے کرام صاحبانِ حال ہیں صرف صاحبان مقال نہیں۔ اور مجھے اس پر بھی یقین تھا کہ تصوف کا وہ حصّہ جو قول و تحریر میں آسکتا ہے وہ میں حاصل کر چکا اور جس حصہ کا حصول قول و سماع کہنے اور سننے سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ ذوق صحیح اور سلوک سے حاصل ہوتا ہے وہ ہنوز باقی ہے۔ اگرچہ وہ علوم شرعیہ اور معلوماتِ عقلیہ جو علوم و فنون کی تحقیق اور ادیان و مذاہب کی تفتیش کے دوران مجھے حاصل ہوئے اُن سے تین چیزوں پر میرا ایمان والقان اس قدر جازم تھا جیسے پتھر کی لکیر۔

۱۔ ذات وصفات الٰہی۔

۲۔ نبوت و رسالت۔

۳۔ عالمِ آخرت۔

یہ تین چیزیں وہ ہیں جن پر میرا ایمان والقان ایسا راسخ وصادق تھا کہ مجھے اس پر کسی مزید دلیل و برہان کی حاجت نہ تھی دراصل اسباب و قرائن اور میرے پیہم تجربوں نے یہ باتیں اور بھی

میرے ذہن نشین کر دی تھیں۔ اور اگر میں اُن اسباب و قرائن کو حدود تحریر میں لا کر زبانِ قلم سے بیان کرنا چاہوں تو یہ ہو نہ سکے گا۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ جب مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ عالمِ آخرت کی سعادت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنا شعار اور خواہشات نفس کے ترک کو اپنا معمول نہ بنایا جائے اور یہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تمام دنیاوی تعلقات ختم نہ ہوں۔ اور یہ علاقے اس وقت ختم ہو سکتے ہیں جب اس دارِ ناپائدار سے روگردانی اختیار کی جائے۔ اور عالمِ آخرت بلکہ اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف رجوع لایا جائے۔

اور یہ بات اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی جب جاہ و مال سے اعراض کرے اور دنیاوی مشاغل و تعلقات سے دور بھاگے۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد جب میں نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی اور اپنے احول کو ٹٹولا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں دنیاوی تعلقات و علائق میں گرفتار ہوں جنھوں نے ہر چہار جانب ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

پھر میں نے اپنی مصروفیات پر نگاہ ڈالی تو ان کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس پایا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ اس درس و تدریس میں کچھ وہ علوم و فنون بھی داخل ہیں جن کی چنداں حاجت نہیں اور نہ وہ طریقِ آخرت میں مفید ہیں۔

اب میں نے باقی علوم پر نگاہ ڈالی کہ ان کی تعلیم و تدریس میں میری نیت کیسی ہے۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ خدمت خالصاً لوجہ اللہ نہیں بلکہ طلب جاہ و شہرت پسندی و ناموری بھی اس کی محرک ہے۔ اور یہ چیز بھی مجھے اس خدمت پر ابھارتی ہے۔

ان حالات میں مجھے یقین ہو گیا کہ میں دوزخ کے کنارے کھڑا ہوں اور اگر میں نے ان کی تلافی نہ کی تو قریب ہے کہ میں دوزخ میں گر جاؤں۔ اور یہ فکر مجھ پہ سوار ہو گئی کہ اب کیا کیا جائے۔

حالات ابھی قابو سے باہر نہ تھے۔ زمام اختیار میرے ہاتھ میں تھی۔ اسی لئے میں کبھی تو یہ عزم مصمم کر لیتا کہ کسی دن بغداد سے نکل کھڑا ہوں اور سب چھوڑ چھاڑ دوں۔ اور کبھی خیال کرتا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ تذبذب کا یہ عالم تھا کہ ایک قدم آگے بڑھاتا تو دوسرا پیچھے ہٹاتا۔ اور اگر کسی صبح کو حصولِ آخرت کی سچی رغبت دل میں پیدا ہوتی تو اسی شام کو

خواہشاتِ نفس حملہ آور ہو کر خیالات کو منتشر کر دیتے تھے۔

حالت یہ تھی کہ ایک طرف اگر دنیاوی خواہشات میرے پاؤں میں زنجیر ڈال کر مجھے کسی مقام پر روکنا چاہتے تو دوسری طرف سے ایمان کا منادی پکار لگاتا کہ سفرِ آخرت کا وقت آگیا۔ تھوڑی عمر اور باقی ہے۔ سفر دور دراز کا ہے اور علوم و فنون کا جو بکھیڑا تم نے پھیلا رکھا ہے یہ سب وہمی اور خیالی باتیں ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اس سفر کی تیاری کر دو۔ ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ علائق اور رشتے اگر آج ختم نہ ہوئے تو پھر کچھ بن نہ پڑے گا۔

ان غیبی آوازوں کو سن کر جب میں خواہشاتِ نفس سے جنگ و فرار کا ارادہ کرتا تو شیطان دل میں وسوسہ ڈالتا کہ یہ عارضی خیالات اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ ان پر مت لگنا۔ یہ تو اب ختم ہوئے جاتے ہیں۔ اور اگر تم نے ان وہمی خیالات کی پیروی میں اس جاہ و منصب اور شان و شوکت کو چھوڑ دیا جو تمھیں بلا تعب و بغیر محنت حاصل ہیں تو پھر تمھارا نفس انھیں کی خواہش کرے گا۔ پھر اس منصب و وجاہت کی تم آرزو کرو گے لیکن یاد رکھنا یہ اعزاز حاصل نہ کر سکو گے۔

کم و بیش چھ ماہ کی مدت اسی تردد و کشمکش میں گزر گئی کہ

میں دنیاوی علاقوں پر نظر دوڑاتا تو وہ اپنی رنگینیاں دکھا کر میرا دل لبھاتے اور دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دیتے۔ اور اُخروی زندگی نگاہ میں آتی تو پھر وہی دل میں کھُپ جاتی اور کوئی چیز نہ بھاتی۔

غرض یہ کہ میں رجب ۴۸۸ھ سے آخر ذی الحجہ سن مذکور تک اسی کشاکش میں مبتلا رہا۔ اور وہی مضمون تھا کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"۔

انھیں ترددات میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ماہ ذی الحجہ میں' میں بے اختیار سا ہو گیا۔ اضطراب و بے چینی نے بڑھ کر وارفتگی کی حالت پیدا کر دی۔ میری زبان بند ہو گئی درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میں کوشش بھی کرتا کہ شوقین طلبہ کو ایک آدھ کتاب پڑھا دوں تو زبان ساتھ نہ دیتی اور میں ایک لفظ نہ پڑھا سکتا۔

اس زبان بندی سے مجھے جو قلق ہوا اُس کا یہ نتیجہ نکلا کہ میری قوت ہاضمہ خراب ہو گئی۔ جو کھاتا پیتا وہ ہضم نہ ہوتا۔ کھانے کا کوئی لقمہ یا پانی کا ایک گھونٹ حلق سے نہ اُترتا۔ قوت جواب دے گئی۔ ہمت پست ہو گئی۔ اطبا نے علاج معالجہ سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ چاروں طرف سے مایوسی نے گھیر لیا۔ معالجوں نے تشخیص کی کہ کوئی قلبی صدمہ پہنچا ہے

اور اُسی کا اثر تمام اعضائے بدن پر ہوا ہے جس نے مزاج کو فاسد کر دیا ہے۔ اب سوائے اس کے کوئی صورت ممکن نہیں کہ جس طرح بن پڑے اُنھیں اس قلبی صدمہ اور دلی غم واندوہ سے نجات دلائی جائے تاکہ انھیں سکون و راحت ملے ورنہ اس حالت میں کوئی علاج و معالجہ سودمند نہیں ہو سکتا۔

اب جبکہ میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا اور میں نے محسوس کر لیا کہ اب یہ معاملہ اختیار سے باہر ہوا جاتا ہے اور میں ایک عاجز محض سا ہوا جا رہا ہوں تو میں نے مضطر و مجبور پریشان و معذور بندے کی طرح بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اُٹھائے اور التجائیں کیں کہ الٰہ العالمین کرم فرما اور مجھے اس طوفان سے ساحلِ مقصود تک پہنچا۔

اور وہ جس کی بارگاہِ رفیع میں بیقراروں، آشفتہ حالوں کی دعائیں پہنچتی اور مقبول ہوتی ہیں، اُس نے میری بھی التجائیں سنیں۔ اور میری دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس دنیاوی عزت و وجاہت بلکہ اہل و عیال اور احباب کو راہِ مولیٰ میں چھوڑ دینا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ میں نے سفرِ مکہ معظمہ کا عزم سب پر ظاہر کر دیا اور سفر کا قطعی ارادہ کر لیا۔

اور اگرچہ میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں شام کی طرف چلوں اور وہیں مقیم ہو جاؤں۔ لیکن خوف یہ تھا کہ اگر خلیفۂ وقت اور دوسرے امراء و اصحاب کو اس بات کا علم ہو گیا کہ میں ملک شام میں اقامت کا قصد رکھتا ہوں تو پھر یہ لوگ آڑے آجائیں گے اور میری دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہو گی۔ اس لئے میں نے لطائف الحیل سے کام لیا۔ لیکن یہ سب پر واضح کر دیا کہ اب میں بغداد شریف واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

لیکن جیسے ہی یہ بات امراء و ارکان سلطنت، بلکہ علماء و ائمۂ عراق کے کانوں تک پہنچی وہ گھبرا گئے اور جب التجا و التماس سے انھوں نے کام بنتا نہ دیکھا تو مجھ پر اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی۔

دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے علما و ائمہ میرے مقصود کو نہ پا سکے۔ اور وہ یہ بات نہ سمجھ پائے کہ اس منصب و وجاہت پر لات مار دینے کا اصل سبب بھی خدمت دین ہے۔ اُن کے دل و دماغ پر یہ بات حاوی تھی کہ خدمتِ دین کی بدولت جو منصب رفیع کوئی شخص حاصل کر سکتا ہے وہ وہی ہے جو غزالی کو حاصل ہے (اور اس منصبِ رفیع سے اعراض کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدمت دین سے

پہلو تہی کر رہے ہیں)

پھر طبقۂ عوام میں کچھ اور ہی چرچے تھے۔ کچھ بیچارے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ترکِ وطن امراء و ارکانِ سلطنت کے اشارے پر ہو رہا ہے اور یہ وہ لوگ تھے جو عراق سے کافی فاصلہ پر بود و باش رکھتے تھے۔ حالانکہ امراء و حکام کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والوں پر یہ امر آشکارا تھا کہ حکامِ وقت تو نہایت الحاح و زاری کے ساتھ مجھے روک رہے تھے۔ اور مجھے اصرار تھا اسی باعث میں اُن سے روگردانی کرتا رہا۔ اور ان کی کسی بات کی جانب میں نے التفات نہ کیا۔

(انھیں عوام میں کچھ ایسے بھی بھولے بھالے مسلمان تھے جو اپنی سادہ لوحی کے باعث یہ کہتے تھے کہ اہلِ اسلام پر کسی کی نظرِ بد لگی ہے۔ اور علماءِ دین کو کسی کی بڑی نگاہیں کھائے جا رہی ہیں۔ اور پھر کہتے کہ بھئی تقدیر و مشیتِ الٰہی یہی ہے۔ خدا و رسول کو یوں ہی منظور ہے۔)

حالات کی رفتار یہی تھی۔ لیکن اصل حقیقت میری نظروں میں تھی۔ اور اسی لئے میں بغداد سے نکل کھڑا ہوا سارا مال و متاع جو میرے قبضہ میں تھا اُس میں سے بقدرِ

کفاف اپنے اور اہل و عیال کے لئے رکھ لیا۔ اور باقی مال و اسباب یہ سمجھ کر وہیں چھوڑ دیا کہ عراق کا مال عراقیوں کی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ میں صرف ہونا چاہئے۔ یہ سب مسلمانوں پر وقف ہے اور عوام الناس کی بہبودی میں صرف کرنے کے لئے اس مال سے بہتر کون سا مال ہو سکتا ہے جسے کسی عالم دین نے اپنے اہل و عیال کے لئے کمایا ہو۔

خیر! میں نے ملک شام کی راہ لی اور تقریباً دو سال وہاں گذارے۔ اور شام میں میرا تمام وقت گوشہ نشینی تنہائی اور ریاضت و مجاہدہ میں گزرا۔ اور اس کے سوا وہاں کام ہی کیا تھا۔ نہیں بلکہ وہاں میرا کام ہی تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق اور یاد الٰہی کے لئے تصفیۂ قلب تھا۔ اور یہاں تصوف و سلوک نے میری راہنمائی کی۔

اب میرا مشغلہ یہ تھا کہ میں کبھی تو دمشق کی جامع مسجد میں بہ نیت اعتکاف چلا جاتا۔ اور وہاں کسی منارہ پر چڑھ کر دروازہ بند کر لیتا اور یاد الٰہی میں تمام تمام دن لگا رہتا۔ اور کبھی یہاں سے چل کر بیت المقدس پہنچتا اور اس کے کسی حجرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھا رہتا اور پورا پورا دن وہیں گزار دیتا۔

جب یہاں رہتے رہتے عرصہ گزر گیا تو اب میرے دل میں حج بیت اللہ کا شوق پیدا ہوا۔ اور میں نے قصد کر لیا کہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں سے برکات حاصل کروں، اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت سے مشرف ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر فیضانِ نبوی سے شرف پاؤں چنانچہ اس ارادہ کے بعد میں حجاز مقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان مقامات مقدسہ کی زیارت سے فراغت کے بعد مجھے اہل و عیال کی یاد آئی اور وطن کی محبت نے پھر وطن میں کھینچ لیا۔ اگرچہ میں اب مخلوق الٰہی کی طرف واپسی کی لیاقت خود میں نہ پاتا تھا، لیکن وطن واپس پہنچ گیا۔ لیکن یہاں بھی تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے لئے یاد الٰہی میں مصروف رہنا میرا مشغلہ تھا۔ اسی لئے وطن میں رہتے ہوئے بھی میں خلوت نشین ہو کر رہ گیا۔

یہاں ایک اور دشواری پیش آئی۔ نئے نئے واقعات کا ظہور۔ اہل و عیال کی ضروریات اور خود میری معاشی حالت نے میرے مقصود و نصب العین پر برا اثر ڈالا۔ یعنی میری تنہائی اور گوشہ نشینی میں تکدر سا پیدا ہونے لگا۔ اگرچہ میں متفرق اوقات میں

فرصت نکال نکال کر عبادت و ریاضت میں مصروف بھی رہتا۔ اس لئے کہ بایں ہمہ میں اپنی منزل سے غافل، اور طمانیتِ قلب و سکونِ دل کے حصول سے مایوس نہ تھا۔ دنیاوی علاقے اور بندشیں راہ میں حائل ہوتی تھیں۔ لیکن میں اپنی دھن میں لگا رہتا۔ اور اسی حالت میں میں نے کامل دس برس[ع] گزار دیئے۔

ع تحقیق اور کاوش سے معلوم ہوتا ہے کہ دس برس کی مدت سفر میں امام صاحب کی حالت یکساں نہیں رہی۔ مدتوں اگر ان پر جذب و محویت طاری رہی تو برسوں وہ سلوک کے عالم میں بھی رہے بلکہ ہر قسم کے علمی مشاغل میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ابوالحسن علی بن مسلم جو امام صاحب کے شاگردوں میں بہت بڑے فاضل گزرے ہیں اور جن کو قوم کی زبان سے "جمال الاسلام" کا لقب ملا اُنھوں نے سفر ہی کی حالت میں بمقام دمشق امام صاحب سے علوم کی تحصیل کی تھی۔ اسی سفر میں آپ نے بیت المقدس والوں کی فرمائش سے رسالہ "قواعد العقائد" لکھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ امام صاحب نے احیاء العلوم اسی سفر میں تصنیف کی اور دمشق میں کتاب مذکور کو ہزاروں شائقین نے خود انھیں سے پڑھا۔۱۲

اِن خلوتوں میں بکرمہ تعالیٰ مجھ پر جو اسرار و نکات منکشف ہوئے وہ نہ قابلِ بیان ہیں نہ احاطۂ تحریر میں ان کا لانا آسان۔ البتہ بہ نیت افادۂ خلق اس میں سے کچھ باتیں بیان کرتا ہوں۔

اس دوران میں مجھے یقینی و قطعی طور پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ (۱) حضرات صوفیائے کرام رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین راہِ مولیٰ پر گامزن ہیں اور ان کا طریق و سلوک بارگاہِ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔

(۲) ان کی سیرت و عادت سب سے افضل ہے۔

(۳) ان کا راستہ باقی راستوں سے صاف اور سیدھا ہے۔

(۴) ان کے اخلاق باقی لوگوں کے اخلاق سے پاکیزہ تر ہیں۔

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ تمام عقلا و حکماء کی عقلیں اور حکمتیں اور اسرار شریعت سے واقفیت رکھنے والوں کی صلاحیتیں اور واقفیتیں اگر مجتمع ہو جائیں تو بھی حضرات صوفیائے کرام کے اخلاق و اطوار کا مقابلہ نہیں کر سکتیں چہ جائے کہ ان سے افضل و برتر ثابت ہوں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام کی تمام

ظاہری اور باطنی حرکات و سکنات انوار نبوت سے فیضیاب رہتی ہیں اور روئے زمین پر نور نبوت کے سوا کوئی اور نور نہیں جس سے دوسرے روشنی حاصل کر سکیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کسی نکتہ چیں کے لئے ایسے مسلک و طریق پر اعتراض کی کیا گنجائش نکل سکتی ہو جس کی پہلی شرط ماسوی اللہ سے دل کو خالی کرنا اور جن کی نماز کی تکبیر تحریمہ، ذکر الٰہی میں دل کا مستغرق ہو جانا اور آخری شرط فنا فی اللہ کا مقام حاصل کر لینا ہو۔

اور فنا فی اللہ ہو جانے کو جو ہم نے تصوف کا آخری مقام قرار دیا ہے در حقیقت یہ آخری مقام نہیں۔ اسے آخری مقام اس لئے کہا جاتا ہے کہ جہاں تک انسان کے کسب و اختیار اور ریاضات و مجاہدات کا تعلق ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ورنہ یہ تو سلوک کا پہلا مقام ہے اور اس سے پہلے کے تمام مقامات کسی مکان کی دہلیز کی طرح ہیں کہ مکان میں داخلہ کے لئے دہلیز عبور کرنا امر ناگزیر ہے

یہی وہ منزل ہے جس کے پہلے ہی مرحلے سے مشاہدات و مکاشفات کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سالک عالم بیداری میں فرشتوں اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مبارک روحوں کو دیکھتا بلکہ اون کی آواز سنتا اور اُن سے فیض حاصل کرتا ہے۔

پھر ان صورتوں اور مثالوں کے مشاہدے میں سالک یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ نہ تو قوت ناطقہ اس حالت و کیفیت کو بیان کر سکتی ہے اور نہ کوئی متکلم ایسے الفاظ میں لا سکتا ہے جن میں صریح غلطیاں نہ ہوں۔ یعنی یہ کہ انسان ان کیفیات و لذائذ کو بیان ہی نہیں کر سکتا اور جو بیان کرتے ہیں اونھیں رسائی نہیں۔

ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند
واں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

رفتہ رفتہ سالک تقرب ربانی و قرب الٰہی کے باعث وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جسے بعض نادان حلول سے تعبیر کرتے ہیں اور کچھ احمق اسے اتحاد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ اسے وصول کہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ تمام

واہی خیالات ہیں۔ اس کی قدرے وضاحت ہم نے اپنی کتاب مقصد الاقصٰے میں کی ہے۔

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ اس کیفیت و لذت کے شناسا بھی اگر اس کے متعلق کچھ زبان کھولیں تو اتنا کہکر خاموش ہو جائیں گے کہ

وَکَانَ مَاکَانَ مِمَّا لَستُ اَذکُرہٗ
فَظُنَّ خَیراً وَّلَا تَسئَلْ عَنِ الخَبَرِ

(ب ؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں)

بالجملہ جس نے علم تصوف کا مزہ نہیں چکھا اس نے نبوت کا نام ہی جانا حقیقت کو نہ پہچانا

ع ذوقِ ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی

ب ؎ یہ سچ ہے

بدل گفتم کہ از دلبر خبر جو
دل آنجا رفت و او ہم بیخبر شد

مولٰنا حسن رضا خاں صاحب حسنؔ بریلوی عرض کرتے ہیں

پار اترتا ہے کوئی غرق کوئی ہوتا ہے	کہیں پایاب کہیں جوش میں دریا تیرا
نئے انداز کی خلوت ہے یہ اے پردہ نشیں	آنکھیں مشتاق رہیں دل میں ہو جلوا تیرا
چاک ہو جائیں گے دل جیبِ گریباں کس کے	دے نہ چھپنے کی جگہ راز کو پردا تیرا
یہ سچ ہے انسان کو کچھ کھو کے ملا کرتا ہے	آپ کو کھو کے تجھے پائیگا جویا تیرا

اور اولیاء بارگاہ الٰہی یعنی خدائے تعالےٰ کے دوست داروں کی کرامتیں بھی دراصل حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے معجزات کی بدایات ہیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حالت اونہیں ایام میں حاصل تھی جبکہ آپ دُنیاوی معاملات سے تعلقات قطع کرکے غارِ حرا میں تشریف لیجاتے اور وہاں خلوت میں اپنے پروردگار اعلیٰ کی

عہ اولیائے کرام کو اللہ عزوجل نے بہت بڑی طاقت بخشی ہے۔ ان میں جو اصحاب خدمت ہیں اُن کو تصرف کا اختیار دیا جاتا ہے۔ سیاہ سفید کے مختار بنادئے جاتے ہیں یہ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائب ہیں ان کو اختیارات وتصرفات حضور کی نیابت میں ملتے ہیں۔ علوم غیبیہ ان پر منکشف ہوتے ہیں مگر بے وساطت رسول کوئی غیر نبی کسی غیب پر مطلع نہیں ہوسکتا۔

کرامت اولیاء حق ہے اور اس کا منکر گمراہ وبد مذہب۔ مردہ زندہ کرنا۔ مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دینا۔ مشرق سے مغرب تک ساری زمین ایک قدم میں طے کرجانا غرض تمام خوارق عادات

عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں تک اُن اطراف کے عرب باشندے یہ کہنے لگے تھے کہ محمد تو اپنے خدا کی محبت میں سب کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے (جل وعلا وصلی اللہ علیہ وسلم)
غرض یہ وہ حالت ہے جس کو راہ سلوک پر چلنے اور اُس کا ذوق رکھنے والے ہی خوب جانتے ہیں ہاں جسے یہ ذوق و وجدان میسّر نہیں وہ اپنے تجربہ و مشاہدہ یا اہل تحقیق سے سُن کر معلوم کر سکتا ہے بشرطیکہ اُسے ان حضرات کی صحبت اور نشست و برخاست کے کافی موقعے حاصل ہوں۔
بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان حضرات اولیائے کرام

(بقیہ حاشیہ ۱۴۸) اولیاء سے ممکن ہیں۔ سوا اس معجزہ کے جس کی بابت دوسروں کے لئے ممانعت ثابت ہو چکی ہے جیسے دنیا میں بیداری میں اللہ عزوجل کے دیدار یا کلام حقیقی سے مشرف ہونا۔ اس کا جو اپنے یا کسی ولی کے لئے دعوی کرے کافر ہے۔
ان سے استمداد و استعانت محبوب اور ان کے مزارات پر حاضری مسلمان کے لئے باعث برکت ہے اور ان کو نزدیک و دور سے پکارنا سلف صالح کا طریقہ ہے ۱۲ مترجم عفی عنہ

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی صحبت میں بیٹھنے والے علامات و قرائن سے بھی اس حالت کو دریافت کر لیتے ہیں بلکہ ان کی صحبت و مجالست کا التزام کرنے والے خود بھی یہ ایمانی کیفیت حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں "ھُمْ قَوْمٌ لا یَشْقیٰ جَلِیسُھُمْ" یہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین سعادت سے محروم نہیں رہتا۔

پھر یہ تو وہ کیفیت و حالت ہے کہ جس شخص کو ان کی دولتِ صحبت اور ذوق و شوق کی سعادت میسّر نہ آئے اُسے اس حالت کا یقین دلانے کے لئے دلائل و براہین قطعیہ بھی قائم کئے جا سکتے ہیں چنانچہ ہم نے اپنی مشہور کتاب "احیاء العلوم" کے بیان "عجائب القلوب" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

غرض یہ کہ یہاں تین درجے متصور ہیں۔

(۱) علم یعنی برہان و دلیل سے اس حالت کا ثبوت۔

(۲) ذوق یعنی اس حالت کی مزاولت اور دائمی مشق۔

(۳) ایمان یعنی سماعت و تجربہ کے بعد حسن ظن اور قبولیت۔

اور قرآن کریم فرماتا ہے "یَرْفَعُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ" یعنی اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور اُن لوگوں کو جنہیں علم دیا گیا ہے درجوں بلند فرماتا ہے۔

اور ان کے علاوہ جاہلوں کا ایک گروہ اور ہے جو اس حقیقت کا منکر ہے۔ بلکہ اس حالت کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اور اس کا ذکر سن کر حیرت و استعجاب سے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔

قرآن کریم ایسوں ہی کے حق میں ارشاد فرماتا ہے۔

"ومنهم من يستمع اليك حتى اذا خرجوا ۔۔۔ الی قولہ تعالیٰ) الصارهم" یعنی اور ان میں سے بعض تمہارے قول کو سنتے ہیں یہاں تک کہ جب یہ منافق تمہارے پاس سے نکل کر جائیں تو علم والوں سے کہتے ہیں کہ ابھی انھوں نے کیا فرمایا، یہ ہیں وہ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کردی اور یہ اپنی خواہشوں کے تابع ہوئے۔ اور یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے رحمت کی اور انھیں حق سے بہرا کر دیا اور آن کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

ان تمام مباحث کے بعد اب ہم اصل مضمون کی طرف رجوع ہوتے اور یہ بتانا چاہتے کہ حضرات صوفیائے کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طریقۂ مرضیہ پر چلنے اور تصوف و سلوک کی معرفت حاصل کرنے کے بعد مجھ پر نبوت کی حقیقت کس طرح روشن ہوئی۔
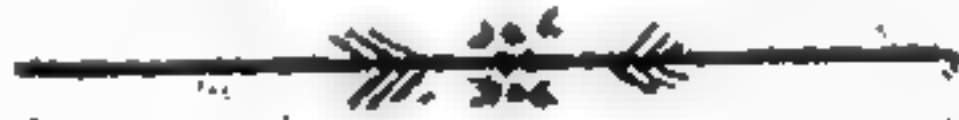
ساتواں مقالہ

حقیقتِ نبوّت اور مخلوق کو اسکی حاجت

واضح ہو کہ انسان اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے ناواقف محض پیدا کیا گیا ہے۔ وقت پیدائش اُسے مخلوقاتِ الٰہیہ میں سے کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔ اور موجوداتِ عالم بکثرت پائے جاتے ہیں۔ خود قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ

یعنی تمہارے رب کے لشکروں کو اُس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔

اب اِن موجودات کا علم انسان کو اپنے ادراک ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور ہر ادراک پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اُس کے

ذریعے آدمی موجودات کی جداگانہ واقفیت حاصل کرے۔ اور عالم سے مراد بھی یہی جداگانہ موجودات ہیں۔

اب سب سے پہلے جس چیز کو انسان میں پیدا کیا جاتا ہے وہ لمس کا احساس ہے۔ جس کے ذریعہ سے انسان ان موجودات کو محسوس کرتا ہے جن کا تعلق چھونے سے ہے۔ مثلاً حرارت، برودت، نرمی، سختی اور خشکی و تری وغیرہ۔

لیکن اس حاسۂ لمس کو ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں جو دیکھنے اور سننے میں آتی ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کے حق میں یہ حاسۂ بالکل معدوم وغیر موجود ہے۔

اس کے بعد پھر انسان کو بصارت دی جاتی ہے۔ یعنی اُس میں دیکھنے کا حاسہ پیدا کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ انسان رنگ و روپ اور شکل و صورت کو دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ اور اس حاسہ کو عالم محسوسات میں بڑی وسعت حاصل ہے

پھر انسان کو قوت سامعہ یعنی سننے کی قوت وقابلیت عطا فرمائی جاتی ہے۔ جس سے وہ آوازیں اور نغمے سنتا ہے۔

اور اِس کے بعد اسے قوت ذائقہ بخشتا ہے یہاں تک کہ عالم محسوسات کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور وہ عالمِ تمیز میں پہنچ جاتا ہے۔ اب اُس کو تمیز کی قوت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان اُن چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جن تک حواس کی رسائی نہیں۔ اور یہ زمانہ انسان کے ساتویں برس کا ہوتا ہے گویا اب اُس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا اور اس کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنتا ہے یعنی محسوسات کے علاوہ دوسری چیزیں اس کے علم میں آتی ہیں۔

اِس کے بعد اس سے بڑھ کر ایک اور زمانہ آتا ہے جس میں اُسے دولتِ عقل بخشی جاتی ہے اور یہ وہ نعمت ہے جس کے طفیل آدمی کو ممکن محال جائز و ناجائز کا ادراک ہوتا ہے۔ اور وہ چیزیں اُس کے احاطۂ علم میں آتی ہیں جن کا ادراک و شعور پہلے دو طریقوں سے ممکن و متصور نہیں۔

لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور درجہ بھی ہے وہاں انسان کی ایک اور آنکھ کھولی جاتی ہے جس سے وہ عالمِ غیب کو دیکھتا اور ان باتوں کو معلوم کر لیتا ہے جو زمانۂ آئندہ میں ظاہر ہونے والی ہیں۔ اور

جس طرح تمیز و عقل سے دریافت کی جانے والی چیزیں حواس سے معلوم نہیں ہوتیں بلکہ وہاں حواس بیکار ولاشئے ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ اسی طرح اس درجے کے مدرکات ومعلومات کے لئے عقل محض بیکار ونکمی ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی درجہ کا نام نبوت ہے۔

اور جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کیا کہ اگر عقل پر نبوت کے مدرکات پیش کئے جائیں تو وہ ان مدرکات و معلومات نبوت کا انکار کردے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نام نہاد عقلاء نے نبوت و مدرکات نبوت کا علی الاعلان انکار کردیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ باتیں ہماری عقل میں نہیں آتیں لہٰذا ہمیں تسلیم نہیں۔ حالانکہ یہ محض نادانی و جہالت ہے کہ جو بات آدمی کے عقل وفہم میں نہ سمائے اس کی حقیقت و اصلیت بلکہ وجود ہی کا انکار کردیا جائے۔

یہ تو وہی مثال ہوئی کہ اگر مادرزاد اندھے کو متواتر شنوائی کے ذریعہ الوان واشکال اور رنگ وروپ کا علم حاصل نہ ہو اور پھر دفعتہً اس کے سامنے یہ ذکر چھڑ جائے تو وہ اس لئے ان کا انکار کردے کہ اس کے علم میں ان کا کوئی وجود نہیں۔

V. Good Example.

پھر اگر انسان اپنی عقل سے کام لے تو اس پر نبوت کی اصلیت خود بخود واضح ہو جائے۔ اس لئے کہ قدرت خداوندی نے نبوت کے مدرکات کا ایک نمونہ ہر انسان میں ودیعت رکھا اور اسے قریب سے قریب تر کر دیا ہے تا کہ انسان نبوت کی معلومات کا انکار نہ کر سکے۔

اور وہ انسان کا خواب ہے۔

غور کیجئے اسی خواب میں انسان کو بعض اوقات اُن چیزوں کا علم ہو جاتا ہے جو اس کے ادراک سے غائب اور زمانہ مستقبل میں واقع ہونے والی ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی ان کا ادراک صراحتہً ہوتا ہے اور کبھی بطور تمثیل جس کی تعبیر معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اب اگر کسی انسان پر خواب کی یہ کیفیت طاری نہ ہو اور پھر اس سے کہا جائے کہ اس عالم میں کچھ ایسے انسان بھی پائے جاتے ہیں جن کی حالت بعض اوقات مدہوشوں بلکہ مردوں کی سی ہو جاتی ہے کہ اُن کے تمام حواس معطل ہو جاتے ہیں اور ان کے اعضاء کام نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود انہیں عالم غیب کی بعض باتیں معلوم

ہو جاتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ شخص جسے خواب کی حقیقت وکیفیت کا کوئی تجربہ نہیں ان باتوں کو تسلیم نہ کرے گا جو خواب کی حالت میں معلوم و مدرک ہوتی ہیں بلکہ اس کے ناممکن الوقوع ہونے پر دلائل قائم کرتے ہوئے کہے گا کہ کسی چیز کے ادراک کا ذریعہ صرف انسانی حاسہ ہے اور جب ان حواس کے ہوتے ہوئے ایک چیز کا ادراک نہیں ہوا تو ان کے معطل ہو جانے کے بعد کسی چیز کا کسی طرح علم و ادراک ممکن نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس کی یہ دلیل تجربہ و مشاہدہ اور واقعات سے غلط و باطل قرار دی جائیگی جبکہ مشاہدہ اپنے مدعا پر دلیل بیّن ہے۔

مختصر یہ کہ جس طرح حواس خمسہ کے بعد کسی شے کے ادراک کیلئے ہمیں "دیدۂ عقل" عطا فرمائی جاتی ہے اور ہم اس باطنی آنکھ سے اُن چیزوں کو اپنے ادراک میں لے آتے ہیں جن تک حواس ظاہری کو رسائی نصیب نہیں ہوتی بلکہ وہ نکمے ہو کر رہ جاتے ہیں اسی طرح "نبوت" بھی ایک ایسی طاقت و قوت کا نام ہے جس کے ذریعے عالم غیب منکشف ہو جاتا ہے اور انسان کی نورانی آنکھیں ایسے امور کا احاطہ کر لیتی ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں

اور ہماری قوت مدرکہ اون کو دریافت کرنے سے قاصر ہے۔

اب اگر کوئی شخص نبوت میں شک کرے تو اس کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں

(۱) امکان نبوت میں شک ہو کہ نبوت پائی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) وقوع نبوت میں شک ہو کہ پائی جاتی ہے یا نہیں؟

(۳) حصول نبوت میں شک ہو کہ فلاں شخص نبی ہے یا نہیں۔

پہلے شبہہ کا جواب یہ ہے کہ نبوت کا امکان کیسا۔ اُس کا وجود یقینی ہے۔ وہ پائی جاتی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عالم میں بکثرت ایسے معارف و معلومات ہیں جن کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عقل اُن کا ادراک کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر علم طب اور علم نجوم کے معلومات کہ جسے یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی رہنمائی نہ فرمائے اور بارگاہ ایزدی سے اُن معلومات کا الہام نہ فرمایا جائے تو حصولِ مدعا کی کوئی صورت

ممکن نہیں۔

اور اگر یہ شبہہ وارد کیا جائے کہ یہ معلومات تجربہ سے حاصل ہوتے ہیں اور الہام ربانی کی یہاں کوئی حاجت نہیں۔

تو جواب دیا جائے گا کہ علم نجوم کے بعض احکام ایسے ہیں جن کا وقوع ہزار برس میں صرف ایک بار ہوتا ہے اور تجربہ نام ہے کسی چیز کی بار بار آزمائش کا۔ تو کیا کسی کی عمر ان علوم کے تجربہ کے لئے کفایت کر سکتی ہے اور کوئی شخص ایسا ذہن میں آسکتا ہے جس نے ہزارہا برس کی عمر پائی اور ان علوم کا تجربہ کر کے تحقیقی احکام لکھے۔

وعلیٰ ہذا القیاس خواص الادویہ یعنی دواؤں کی خاصیتیں۔

لہٰذا ہمیں یہ بات آخر کار تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ جن امور کا ادراک عقل کے ذریعے ممکن نہیں اُن کے ادراک کے لئے ایک اور طاقت کی ضرورت ہے اور اسی طاقت یا طور کو ہم "نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور "نبوت" سے یہی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔

بلکہ ایسی چیزوں کا دریافت کرنا جو عقل کی معلومات سے ماوراء ہیں نبوت کے خواص میں سے ایک خاصہ ہے ورنہ خواص نبوت اپنی کثرت کے باعث نہ الفاظ میں سما سکتے ہیں نہ بیان میں آسکتے ہیں ۔ اور یہ جو کچھ ہم

بیان کر رہے ہیں وہ معلومات و مدرکاتِ نبوت کی بہ نسبت ایسے ہی ہیں جیسے سمندر کے مقابل ایک قطرہ!

مدرکاتِ نبوت کی طرف ہم نے یہ چند اشارے اس لئے کر دیئے کہ انسان کے سامنے ایک تو معلومات خواب ہیں اور دوسرے علم طب و علم نجوم کے معلومات جن سے مدرکاتِ نبوت کی طرف ایک گونہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے

بلکہ حق تو یہ ہے کہ طب و نجوم کی واقعی معلومات انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے معجزات ہیں۔ ورنہ یہ حکما و عقلا اپنی عقلوں کے سرمایہ سے ان معلومات کے حاصل کرنے کی کوئی اہمیت و قابلیت نہیں رکھتے۔

پھر مدرکاتِ نبوت کی طرف رہنمائی کرنے والی یہ تو وہ معلومات ہیں جو عامہ مخلوق کو حاصل ہیں۔ رہے حضرات صوفیائے کرام رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین، تو ان حضرات نے اپنے علم تصوف و سلوک سے نبوت کے اور بھی خواص دریافت کر لئے ہیں۔ اور یہ وہ خواص ہیں جو تصوف

وسلوک کی متابعت کا ذوق رکھنے والے حضرات ہی کو حاصل ہوتے ہیں۔

غرض کہنا یہ ہے کہ عقل سلیم رکھنے والا ..... خواب کی کیفیت کا اندازہ لگا کر فی الجملہ نبوت کے مدرکات کو سمجھ سکتا ہے۔ اور جس شخص کو یہ کیفیت حاصل نہیں یا وہ اُس کا قائل نہیں (حالانکہ یہ محض عناد ہے) وہ نہ مدرکاتِ نبوت کو سمجھ سکتا ہے نہ اُس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

بعینہٖ یہی حالت ہے نبوت کے اُن مدرکات کی جن کا نمونہ میسر نہیں کہ نادان انسان اس کے باعث مدرکاتِ نبوت کو نہیں پہچان سکتا۔ اور جب انھیں سمجھ نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ تصدیق بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ آدمی پہلے بات کو سمجھتا ہے پھر اُس کی تصدیق کرتا اور اُسے مانتا ہے۔

لیکن تصوف وسلوک وہ علم ہے جس کے ابتدائی مراحل ہی میں انسان کو وہ نمونہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا ذوق و وجدان اُسے مدرکات و معلوماتِ نبوت کی تصدیق پر آمادہ کر دیتا ہے اور انسان اُن معلومات پر ایمان لے آتا ہے جو عقل و فکر کی دسترس

و رسائی سے بلند و بالا ہوتی ہیں۔

اور اس راہ کی ایک ہی خاصیت، اصل نبوت پر ایمان و اذعان کے لئے کافی و وافی ہوتی ہے اور ایسے شخص کو کوئی شک و شبہ نبوت میں باقی نہیں رہتا۔

اور اگر کسی شخص کو اس پر شک ہے کہ فلاں شخص علی التعیین نبی ہے یا نہیں تو یہ شک اُس شخص معین کی کردار و گفتار و احوال سے دفع کیا جا سکتا ہے اور اس کے اور اُس کی اور اُس کی نبوت کی تصدیق کی جا سکتی ہے

اب احوال کی معرفت و دریافت کے لئے دو طریقے متصور ہیں۔

اول مشاہدہ و زیارت۔

دوم بطور تواتر سماعت۔

دیکھئے آپ فقہ یا علم طب حاصل کرتے ہیں تو علم کے ساتھ ساتھ آپ کو فقہا و اطبا کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ خواہ اُنہیں دیکھ کر بشرطیکہ ملاقات ہو ورنہ اُن کے حالات سن کر بھی اُن کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور آپ کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ مثلاً امام شافعی (یا امام ابو حنیفہ) مشہور فقیہ

تھے اور جالینوس ایک حکیم تھا۔

اب یہ علم محض تقلیدی نہیں بلکہ تحقیقی ہے کہ واقعۃً اُن کا وجود تھا۔ وہ موجود تھے اور اُن کی طرف رہنمائی کرنے والی وہ کتب و تصانیف ہیں جو ان علوم و فنون میں تصنیف کی گئیں۔ اور جن سے تمھیں ان علوم کی تحصیل میں مدد ملی۔ اور انھیں تصانیف سے تم کو مشہور و معروف فقہا و اطبا کا علم ہوا۔

اسی طرح جب آپ نبوت کے معنی سے واقف ہیں تو آپ قرآن کریم و احادیث کریمہ کا غور سے مطالعہ کیجیے آپ پہ یہ بات خود بخود روشن ہو جائے گی کہ بلا شبہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے برگزیدہ رسول اور عزت والے نبی ہیں۔

اور اگر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بھی اپنے مطالعہ میں لائیں، بالخصوص وہ تعلیمات جو تصفیۂ باطن اور قلب کی صفائی کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں تو آپ کے خیالات میں اور بھی استحکام پیدا ہو جائے گا اور آپ اپنے قلب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا مؤید پائیں گے۔

ہم بطور تمثیل یہاں چند احادیث کریمہ نقل کرتے ہیں۔

(۱) مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرِثَهُ اللّٰہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔

جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل کرے اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے اُن علوم کا وارث و حامل کر دے گا جو اُسے حاصل نہیں۔

(۲) مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ

جو کسی ظالم کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسی ظالم کو اُس پر مسلّط کر دیتا ہے۔

(۳) جو شخص صبح اس حالت میں بیدار ہو کہ اُسے صرف اُس ایک کی فکر ہو تو وہ مالک ومولیٰ اُس کی دنیا و آخرت کا ہر غم دور فرما دیتا ہے۔

ان احادیث کریمہ کا مقابلہ عقلا و حکماء زمانہ کے دس بیس اقوال نہیں بلکہ ہزار دو ہزار بلکہ اس سے بیشتر اقوال کے مقابلہ میں رکھئے تو آپ پر یہ حقیقت آشکارا ہو گی کہ یہ احادیث قطعاً حق ہیں اور ان میں شک کا شائبہ بھی نہیں ہے۔

اور در اصل احادیث کریمہ ہی وہ رہنما ہیں جو تعلیماتِ نبوت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتی ہیں اور اُن کے باعث انسان نبوت کو تسلیم کرتا ہے۔ ورنہ

مثلاً عصا کا سانپ اور چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا وغیرہ معجزات تو اِن اقوال کے مؤیّد ہوتے ہیں نہ کہ نبوت پر مستقل دلیل۔

اور یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی شخص کی نگاہ صرف آپ کے کسی معجزے پر پڑے اور اُس کی نظر میں وہ بکثرت کثیرہ قرائن و دلائل نہ ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت راستبازی پر دلالت کرتے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والا اُسے جادو یا مسمریزم وغیرہ کا شعبدہ سمجھ بیٹھے اور نبوت کا قائل نہ ہو کر ہلاکت کے گڑھے میں جا پڑے۔

اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے۔

يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِیْ مَنْ يَّشَاءُ۔

غرض ایسے لوگوں کے دل میں مختلف وسوسوں کے پیدا ہوتے اور اُن کے باعث ان کے گمراہی میں پڑے رہنے کا قوی اندیشہ ہے۔

ہاں اگر نبوت پر ایمان لانا اُسے تسلیم کرنا اور ماننا کسی ایسے مسلسل و منظم اور دل میں اتر جانے والے کلام کے باعث ہے جو صداقت و حقیقت سے لبریز

اور معجزات کی صداقت پر بھی دلالت کرتا ہے تو یہ معجزے اس کے ایمان کو اور زیادہ مستحکم و مضبوط کر دیتے ہیں۔ اور انسان ایسا راسخ العقیدہ ہو جاتا ہے کہ معجزات و مدرکات نبوت پر وارد کئے جانے والے کسی بالائی و سطحی اعتراض کو خطرہ میں نہیں لاتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خوارق عادات و معجزات نہ نبوت کیلئے اصل الاصول ہیں نہ اُن پر نبوت کا مدار کار۔ بلکہ نبوت کی صداقت پر جہاں اور دلائل و قرائن قائم ہیں وہیں معجزہ بھی ایک دلیل اور ایک قرینہ ہے۔ اور انھیں دلیلوں اور قرینوں کے مجموعہ سے نبوت پر وہ یقین و وثوق کامل حاصل ہوتا ہے کہ آدمی علی التعیین کسی ایک دلیل یا قرینہ کو نبوت کی اصل الاصول نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ اُسے اس سلسلہ میں کسی دلیل معین پر اعتماد کلی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ہر دلیل و قرینۂ نبوت کو دلیل و قرینہ سمجھتا ہے کسی مخصوص کو نہیں۔

اِسے یوں سمجھئے کہ کسی شخص کو اخبار متواترہ سے کسی بات کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ یا شہرت عامہ سے اُسے کسی بات کے وجود کا یقین دلایا تو یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس یقین کی مورث وہ خبر ہے جو فلاں شخص نے

دی تھی۔ بلکہ اس علم ولیقین کا مورث غیر متیقن ہے لیکن مجموعہ اعداد سے خارج نہیں۔

غرض یہی علم یقینی علم ہے جسے "علم الیقین" کہا جاتا ہے۔

ہاں نبوت کا جو علم بطور ذوق حاصل ہو وہ مشاہدہ کا حکم رکھتا ہے۔

اور یقین و وثوق کی یہ حالت و کیفیت سلوک و تصوف سے ہٹ کر کہیں اور نہیں پائی جاتی۔

اس مقام پر نبوت سے متعلق اسی قدر کلام کافی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ دوسرے مواقع پر یہ کلام تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

ع ہ نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب مختصراً تو یہ ہے کہ اس کا حقیقی اذعان اس برگزیدہ شخص ہی کو حاصل ہوتا ہے جسے قدرت یہ منصب ملتہ تفویض فرماتی ہے۔ لیکن وہ نفوس قدسیہ جنہیں کرم خداوندی اپنے دوستداروں میں شمار فرماتا ہے۔ اور جو اپنی ریاضت و مجاہدے کے باعث قلب میں وہ صفائی پیدا کر لیتے ہیں کہ ماسوی اللہ کا ہر حجاب درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸ ۔ وہ حضرات بھی اپنے مکاشفات و مشاہدات میں نبوت کا صحیح مقام معلوم کر لیتے ہیں اور حقیقت نبوت کو ذوقی طریقے سے سمجھ لیتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ منکر کی اس حوالۂ ذوق سے کوئی تسلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے امام صاحب نے ایک اور طریقے سے اپنے مدعا یعنی صحت و اثبات نبوت پر استدلال کیا اور فرمایا ہے کہ:

اتنی بات تو ہر شخص کو تسلیم ہے کہ انسانی صفات تمام آدمیوں میں یکساں نہیں پیدا کی گئیں۔ بلکہ اُن میں باہمی تفاوت ہمارا رات دن کا مشاہدہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں میں کوئی تو ایسا کودن اور ناسمجھ اور موٹی عقل کا ہوتا ہے کہ بار بار سمجھانے پر بھی بڑی مشکل سے سمجھتا ہے اور کوئی ایسا ذکی و ذہین ہوتا ہے کہ بغیر سکھلائے ہی ہر بات کی تہہ کو پہنچ جاتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی یہی کیفیت ہے۔ اس لئے کہ کسب و تعلم کے بغیر ان حضرات کو حقائق اشیاء کا ادراک ہو جاتا ہے۔ اور وہ دقائق جنہیں اور کوئی حل نہیں کر سکتا وہ خود بخود ان پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اسی قوتِ ادراکہ کا نام ملکۂ نبوت ہے جو پڑھنے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹

اور سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ (بلکہ بارگاہِ الوہیت سے اُنھیں یہ منصب رفیع عطا فرمایا جاتا ہے)

امام صاحب نے صوفیہ کے علوم کی ایک مثال دی ہے کہ :

" ایک دفعہ روم اور چین کے نقاشوں میں مقابلہ ہوا ـــــ دونوں اپنی اپنی فضیلت کے مدعی تھے ـــــ بادشاہ وقت نے آمنے سامنے کی دو دیواریں دونوں گروہوں کے لئے مقرر کر دیں تاکہ ہر ایک اپنے حصہ کی دیوار پر اپنی کاری گری کا نمونہ دکھائے ـــــ بیچ میں پردہ ڈال دیا، تاکہ ایک دوسرے کی نقل نہ کرنے پائے۔ چند روز کے بعد رومی مصوروں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ـــ "ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے" چینیوں نے کہا کہ ہم بھی فارغ ہو چکے۔

جب پردہ اُٹھایا گیا تو دونوں میں سرِمُو فرق نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ رومیوں نے بجائے نقاشی کے صرف یہ کیا تھا کہ دیوار کو صیقل کر کے آئینہ بنا دیا تھا۔ پردہ اُٹھا تو سامنے کی دیوار کے تمام

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰

نقوش اس میں اُبھر آئے"

توحضرات صوفیائے کرام بھی اپنے قلب کو اس قدر صاف و مجلا کر لیتے ہیں کہ تمام معلومات خود بخود اس میں منقش ہو جاتے ہیں۔

ستر ھواں مقالہ

درس و تدریس اور اشاعتِ علم کی طرف واپسی کا سبب

یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ دس برس کی مدتِ سفر اور یہ طویل زمانہ گوشہ نشینی میں نے ضائع نہیں کیا۔ بلکہ مجاہدات و ریاضات کو اپنا مشغلہ بنا کر یادِ الٰہی میں مصروف رہا تو مجھ پر کبھی اسباب و وجوہ سے کبھی ذوق و وجدان سے اور کبھی دلیل و برہان سے اور کبھی یقین و ایمان سے یہ حقائق منکشف ہوئے کہ ۔۔۔

(۱) انسان کی ترکیب دو چیزوں سے ہے۔

ایک بدن ، دوسرا قلب ؏

اور قلب سے میری مراد یہاں انسان کی حقیقت روحانی ہے جو معرفت الٰہی کی محل ہے نہ کہ صنوبری شکل کا وہ گوشت کا ٹکڑا جو ہم جیسے مُردِہ دل اور چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

؏ اصل میں تین چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ نفس ، روح ، قلب۔

روح بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور نفس و قلب اس کے دو وزیر ہیں۔ نفس اس کو ہمیشہ شر کی طرف بلاتا ہے اور قلب جبتک صاف ہے خیر کی طرف بلاتا ہے اور معاذاللہ کثرتِ معاصی اور خصوصاً کثرتِ بدعات سے اندھا کر دیا جاتا ہے۔ اب اس میں حق کے دیکھنے ، سمجھنے اور غور کرنے کی قابلیت نہیں رہتی مگر ابھی حق سننے کی استعداد باقی رہتی ہے۔ اور پھر معاذاللہ اوندھا کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ نہ حق سن سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے بالکل چوپٹ ہو کر رہ جاتا۔ اور برباد ہو جاتا ہے۔

(۲) بدن کی دو مخصوص حالتیں ہیں۔
صحت وتندرستی۔ مرض وبیماری۔
صحت یا تندرستی بدنِ انسانی کی صلاح وخیریت کی موجب ہے اور
مرض یا بیماری انسانی ہلاکت وبربادی کی باعث۔
بدن کی طرح قلب کی بھی دو کیفیتیں ہیں۔
سلامتی اور کجروی۔
سلامتی قلب انسان کی نجات وکامیابی کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔
اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ
لیکن وہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا۔

حاشیہ صفحہ ۱۷۳۔ قلب حقیقۃً اس مضغہ گوشت کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک لطیفۂ غیبیہ ہے جس کا مرکز یہ مضغۂ گوشت ہے۔ سینے کے بائیں جانب اور نفس کا مرکز زیر ناف ہے۔ شافعیہ اسی لئے سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں کہ نفس سے جو وساوس اُٹھیں وہ قلب تک نہ پہنچنے پائیں۔
اور حنفیہ زیرِ ناف باندھتے ہیں کہ

(باقی صفحہ ۱۷۵ پر)

اور قلبی مرض اُس کی اُخروی ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ۔ قرآن کریم میں ہے۔

فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ

ان کے دلوں میں بیماری ہے۔

(۳) جہل باللہ یعنی معرفتِ الٰہی نہ ہونا انسان کے لئے زہر قاتل ہے۔ اور خواہشات نفسانیہ کا اتباع اور اطاعتِ الٰہی سے اجتناب و گریز قلبِ انسان کا اہم مرض اور طاعت و فرمانبرداریِ حق اور مخالفت نفس اس مرض کی دوائے شافی۔

(۴) جس طرح امراض بدنی کا علاج مخصوص دواؤں کے بغیر ممکن و میسر نہیں۔ اور بدنی امراض اِن دواؤں کے بغیر زائل نہیں ہوتے اسی طرح روحانی و قلبی امراض سے قلب کا معالجہ مخصوص دواؤں کے بغیر ممکن نہیں

(حاشیہ صفحہ ۱۷۳) سر چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل

یعنی گریستن روز اول باید۔ اسی واسطے یہ تحریر کیا گیا ہے کہ اگر ہاتھ سختی سے باندھے جائیں تو وساوس پیدا نہ ہوں ۱۲۔ (الملفوظات) مترجم عفی عنہ۔

اور نہ قلب ان روحانی ادویہ و اغذیہ کے بغیر صحت مند رہ سکتا ہے۔

(۵) جسمانی امراض سے بدن انسانی کو شفا دینے والی دوائیں یا غذائیں اپنا جو اثر دکھاتی اور تاثیر پیدا کرتی ہیں اُن کا ادراک "عقلاء زمانہ" کو میسر نہیں۔ اور نہ یہ عقلاء اُن تاثیرات کو اپنے عقلی سرمایہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس علم کی تحصیل میں ان حکماء و اطباء کی پیروی و پیروی لازمی ہے جنھوں نے اس علم کو اُن انبیاء کرام علیہم السلام سے حاصل کیا جنھیں کرامت و شرف نبوت کی بدولت خواص استیاء و تاثیرات ادویہ پہ مطلع فرمایا گیا۔ اور بالکل اسی طرح روحانی امراض کے علاج میں جن دواؤں اور غذاؤں یعنی مخصوص عبادتوں کی اپنی حدود مقررہ اور مقادیر محددہ میں رہتے ہوئے ضرورت پیش آتی ہے۔ اور پھر یہ دوائیں اپنی باطنی و روحانی تاثیرات پیدا کرتی ہیں اُن کا علم بھی عام عقل انسانی کو میسر نہیں ۔ بلکہ یہاں اُن حضرات عالیہ کی تقلید و اتباع لازمی ہے جنھیں انبیاء و مرسلین کہا جاتا ہے اور جنھیں یہ علم اپنی عقل کی پونجی کی بدولت نہیں بلکہ نور نبوت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

(۶) ادویۂ مرکبہ جنہیں مرکبات کہا جاتا ہے مختلف انواع اور مختلف اجناس و مقادیر سے ترکیب پاتی اور عالم وجود میں آتی ہیں یعنی ان دواؤں کے اجزاء میں باہمی فرق ہوتا ہے کہ کوئی دوا دوگنی ہوتی ہے کوئی اور زیادہ کوئی برائے نام۔ تو یہ اوزان و مقادیر کا فرق اپنے اندر ایک خاص راز رکھتا ہے جس کا تعلق خواص اشیاء سے ہے۔

اسی طرح عبادات جو ادویۃ القلوب یعنی روحانی امراض کی دوائیں ہیں یہ بھی مختلف انواع و متفرق مقادیر کے اعمال سے ترکیب پاتے ہیں۔

مثلاً ایک رکعت میں ایک رکوع ہے اور دو سجدے۔

نماز فجر، نماز عصر کی نصف ہے اور یہ اس کی دوگنی۔

تو اس میں بھی اُس معبود حقیقی نے خاص اسرار و رموز کا لحاظ فرمایا ہے جنھیں از قبیل خواص کہا جاسکتا ہے اور ان کی اطلاع نور نبوت کے بغیر ممکن نہیں اور نہ اس وسیلہ کے بغیر کسی کو ان پر کوئی دسترس۔

اور وہ جو ان اسرار و رموز و خواص کی دریافت

ہیں صرف اپنی اندھی اور اوندھی عقل پر اعتماد کرتے اور دماغ لڑاتے ہیں وہ در اصل اپنی حماقت کا اظہار کرتے ہیں۔

اور اس سے بڑھ کر جہالت میں اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ اعداد رکعات اور ارکان صلوات اور دیگر عبادات میں کمی بیشی کا تفاوت محض امر اتفاقی ہے۔ اس میں کسی سِرّ الٰہی کا وجود نہیں پایا جاتا کہ ان اشیاء مذکورہ بالا کو اس سِرّ و حکمتِ الٰہی کا خاصہ یا نتیجہ کہا جا سکے۔

(۷) ادویات میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں۔ اصول یا ارکانِ ادویہ اور زوائد یا متممات کہ ان میں سے ہر متمم کو اپنے اصول کی تاثیر و اثر اندازی میں کافی دخل ہوتا ہے۔

اسی طرح سنن و نوافل، اصول و ارکان عبادت کے متمم ہیں یعنی ارکانِ عبادات کی تکمیل و تاثیر کا ان سے خاص تعلق ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرات انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰت والتسلیمات روحانی بیماریوں کے طبیب و معالج ہیں اور جب عقل انسانی اسے تسلیم کرتی ہے تو اس کا فائدہ

اسی میں ہے کہ صداقتِ نبوت پر شہادت دے اور اُن امور و اشیاء کے ادراک و تصور میں خود کو بمنزلۂ نابینا تصور کرے جن کو چشم نبوت ہی دریافت کر سکتی ہے۔ بلکہ جس طرح ایک نابینا آدمی اپنے آپ کو اُس شخص کے اوپر چھوڑ دیتا ہے جو اُس کی لاٹھی پکڑ کر رہنمائی کرے یا جس طرح ایک پریشان حال و حیرت زدہ مریض شفیق طبیب کے رحم و کرم پر رہ کر اپنے نفس کو بھول جاتا ہے یوں ہی ہم پر ضرور ہے کہ ہم ان حضرات انبیاء و مرسلین ہی کی پیروی کو اپنا شعار بنائیں ۔ یہیں تک عقل کی رسائی ہے اور یہی پرواز عقل کا منتہا ہے۔ اس سے آگے نہ یہ قدم بڑھ سکتی ہے نہ کسی منزل کو پا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق میری دس سالہ جانفشانی و محنت کا نتیجہ یا میری گوشہ نشینی و خلوت کا ثمرہ ہیں لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ۔

(ا) بعض لوگوں کے اعتقادات ، اصل نبوت ہی کی طرف سے فاسد ہیں۔

(ب) کچھ وہ ہیں جو نبوت کو تسلیم کرتے ہیں

لیکن اُس کی حقیقت سے واقف نہیں۔

(ج) اور کچھ وہ ہیں جنھیں اصل نبوت و حقیقت نبوت میں تو کوئی شک و شبہہ نہیں لیکن دربار نبوت سے جو حکم دیا جاتا ہے وہ اس کی بجا آوری و تعمیل سے قاصر رہتے ہیں۔

خیر تو جب میں نے مخلوق الٰہی میں یہ انتشار پایا تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح وہ اسباب معلوم ہوں جن کے باعث خلقت میں یہ بد اخلاقی و بد عقیدگی اور ایمانیات کی طرف سے لاپرواہی پائی جاتی بلکہ اُن میں نشو ونما پا رہی ہے۔ بالآخر میں اپنی تفتیش و تحقیق میں کامیاب ہوا اور غور و تامل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ موجودہ انتشار و پراگندگی کے ذمہ دار چار قسم پر ہیں۔

(۱) علوم فلسفہ میں غلو و انہماک رکھنے والے۔

(۲) علم تصوف و سلوک کی کنکاش اور ناکام جستجو کرنے والے۔

(۳) امام معصوم سے تحصیل علوم کے مدعی۔

(۴) نام نہاد علماء و مقتدایان ملت۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا کہ مجھے عامۂ طبقۂ انسانی کی اس غفلت و لاپرواہی کے اسباب کی ایک

عرصہ تک بڑی جستجو رہی۔ میں لوگوں سے فرداً فرداً ملتا اُن کے ماحول کو ٹٹولتا اور خود اُن لوگوں سے دو بدو گفتگو کرتا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر شریعت اسلامیہ کی پیروی واتباع میں تم لوگ اس قدر کوتاہی ولاپرواہی سے کیوں کام لیتے ہو۔ اگر کوئی حکم ایسا ہے کہ تم اُس کی تعمیل و بجاآوری میں پس وپیش رہتے ہو تو اگر کوئی شک وشبہ ہو تو بیان کرو تاکہ حقیقت واضح ہو اور اگر عقائد و اصول اسلام میں سے کسی عقیدہ پر تمہیں یقین نہیں تو اُس کی وجہ بیان کرو تاکہ اُن شبہات کا جواب دیا جائے۔

اور اگر نہ یہ ہے نہ وہ تو پھر مجھے بتاؤ کہ شریعت کی متابعت سے کیوں گریز کرتے ہو۔ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو پھر زادِ راہ آخرت کی کوشش کیوں نہیں کرتے اس راہِ پُرخطر کے لئے توشہ کی فراہمی کے لئے کیوں مستعد نہیں ہوتے۔

ہاں اگر اُس لازوال وابدی زندگی پر اس دنیاوی اور فانی زندگی کو ترجیح دیتے اور آخروی نعمتوں کو دنیاوی دلفریبیوں اور رنگینیوں کے عوض فروخت کرتے ہو تو یہ تو سخت نادانی وجہالت کا کام ہے۔

بھلا غور تو کرو جب تم اپنے دو روپوں کو ایک

روپے کے عوض دے ڈالنا پسند نہیں کرتے بلکہ اسے حماقت پر محمول کرتے ہو تو سخت حیرت و استعجاب کا مقام ہے کہ تم بے شمار نعمتوں اور گمان و قیاس سے بالاتر آسائشوں کو چند روزہ زندگی کے بدلے میں بیچ رہے ہو۔

اور اگر خدا نخواستہ آخرت پر یقین کامل نہیں تو یہ تو کفر صریح ہے۔ اس کے ہوتے دعوئی ایمان کب مسموع ہو سکتا ہے۔ ایمان حاصل کرنے کے لئے تمام ضروریات۔ دین کی تصدیق لازمی ہے لہٰذا مسلمان بننے کی پہلی ضرورت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آخر اس کفر خفی کا سبب کیا ہے جو آدمی کے دل میں گھر کر گیا ہے اور اسی باعث اس کا ظاہر خلاف احکام شرع ہے۔ مگر ظاہراً اس کا اظہار کرتے گھبراتا ہے خواہ اس لیے کہ اس کے نام کے ساتھ لفظ مسلمان لگا ہوا ہے یا اس لیے کہ شریعت اسلامیہ سے متعلق اس کی نام نہاد غیرت و حمیت اجازت نہیں دیتی یا سلاطین وقت کا خوف ہے۔ بہر حال وہ اپنے دل کا چور ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

اور آپ کو یہ سن کر سخت تعجب ہو گا کہ میرے

ان سوالات کے جواب میں ایک شخص نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ اگر شریعت کی متابعت لازمی وضروری چیز ہوتی تو علماء اسلام پر اس کا التزام تمام مخلوق سے زیادہ واجب تھا حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض علماء نماز پنجگانہ کے پابند نہیں۔ بعض عالم چوری چھپے شراب پینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اور انہیں علماء میں وہ بھی ہیں جو حرام مال سے پرورش پاتے اور اوقاف و یتامیٰ کے اموال پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ بعض احکام اسلام کو نافذ کرنے والے جنہیں قاضی اسلام کہا جاتا ہے وہ رشوت لیتے ہیں۔

بلکہ ایک صاحب تو دونی اُڑے اور کہنے لگے کہ ہمارا شمار تو صوفیاء کرام میں ہے اور ہم اپنی ان عبادات وریاضات کے باعث اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں کسی عبادت وریاضت کی حاجت نہ رہی۔

تیسرے صاحب بولے کہ ہم تو اہل اباحت سے ہیں ہم پر شریعت مطہرہ کی پابندی لازمی نہیں۔

اہل اباحت وہ لوگ ہیں جو مسلک صوفیائے کرام پر چلے لیکن راہ ہی میں بھٹک کر رہ گئے۔

چوتھے صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس زمانہ شور و شغب میں کہ ہر طرف اختلاف کی بھرمار ہے منزلِ مقصود نظر نہیں آتی تو حق کی شناخت کیسے ہو؟ زمانہ موجودہ میں مذاہب مختلفہ کے اختلاف کی کثرت نے تمام راہیں بند کر دیں ہر گروہ اپنے مذہب کو حق اور مخالفین کے طریق کو باطل بتاتا ہے عقلی دلائل جو پیش کئے جاتے ہیں اُن میں باہمی تعارض و تنافی ہے۔ اہل رائے کی رائے پر اعتماد نہیں۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ مذہب باطنیہ یا اہلِ تعلیم کو اختیار کیا جائے۔ اس لئے کہ یہاں کسی دلیل و حجت کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر مسئلہ یقینی ہے تو اس یقین کو چھوڑ کر ان شکوک کی پیروی کیوں کی جائے اور دراصل ان صاحب کا تعلق ہے بھی فرقہ باطنیہ سے۔

اور پانچویں صاحب یوں گویا ہوتے ہیں کہ میرا یہ فعل تقلیدی نہیں۔ بلکہ میری تحقیقات کا نتیجہ ہے اسلئے کہ میں نے علم فلسفہ پڑھا اور حقیقت نبوت کو پرکھا ہے اس کا مآل اور خلاصہ کار مخلوق کی اصلاح و تربیت اور انھیں حکمت کی تعلیم دینا ہے۔ اور انبیاء کرام نے جن عبادات کی تاکید و تلقین فرمائی ہے وہ مخلوق کے

نظم ونسق کو باقاعدگی کے ساتھ چلانے اور اُن کے باہمی نزاعات کو مٹانے اور شہوات کے طوفان سے اُنہیں بچانے کے لئے ہیں یہ عبادات خود مقصود نہیں اور میں تو پڑھا لکھا آدمی ہوں عوام جاہلوں سے نہیں تو مجھے کیا غرض ہے کہ مکلف بنوں اور شرعی احکام کی تکالیف برداشت کروں ۔ میں حکماء وقت کے گروہ میں شامل اور حکمت کا تابع ہوں۔ میں ہر بات سمجھتا ہوں اس لئے مجھے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں "

غرض علوم فلسفہ میں سے الہیات کا مطالعہ کرنے والوں کا یہی منتہائے علم ہے ۔ ان کے بڑوں یعنی علی ابن سینا اور ابونصر فارابی وغیرہما نے یہی اپنی تصانیف میں صراحتہً یا کنایتہً لکھا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اسلام کے ساتھ صرف رسمی عقیدت ہے ۔ ان میں سے بعض قرآن کلام کی تلاوت کرتے، ماہ مبارک رمضان کے روزے رکھتے اور جمعہ وعیدین میں حاضر ہوتے ہیں ۔ اپنی زبان سے شریعت اسلامیہ کی تعریف کرتے اور اکثر اوقات اُس کے احکام کو سراہتے ہیں ۔

لیکن با ایں ہمہ فسق و فجور سے باز نہیں آتے۔ شراب خوری کو معیوب نہیں جانتے جام پر جام چڑھا جاتے ہیں۔ لہو ولعب میں اپنی عمریں گنواتے ہیں۔

اور لطف یہ ہے کہ جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب تمہاری نگاہوں میں نبوت کا کوئی خاص مقام نہیں اور تعلیمات نبوت کی تعمیل و فرمانبرداری لازم نہیں تو تم نماز روزہ وغیرہ کس نیت سے ادا کرتے ہو؟

اس کا جواب کبھی تو دیا جاتا ہے کہ اس سے جسمانی ریاضت ہو جاتی ہے۔

کبھی کہتے ہیں لوگوں کی دیکھا دیکھی شرما حضوری ادا کر لیتے ہیں۔

کبھی جواب دیتے ہیں اس سے اہل وعیال اور جان و مال کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

اور کبھی کہہ بیٹھتے ہیں کہ دراصل شریعت اور اس کی تعلیمات حق ہیں۔ نبوت برحق ہے۔ تو ہمیں اس کی اطاعت ضروری ہے۔"

پھر جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ "یہ شراب نوشی کیسی"

تو جواب دیتے ہیں کہ یہ حکمت الہٰی کے خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اس لئے حرام فرمائی ہے کہ اس میں نشہ ہے اور نشہ باعث فتنہ و فساد۔ لیکن میں حکیم ہوں اشیاء کی حقائق سے واقف ہوں۔ اس لئے میں شراب کو اس ترکیب سے استعمال کرتا ہوں کہ اس کا نشہ ختم ہو جاتا ہے اور میں فتنہ و فساد سے محفوظ رہتا ہوں۔ پھر شراب نوشی سے میری غرض محض حصولِ لذت نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ قوت ہاضمہ درست اور ذہن کشادہ رہے۔ رنج والم قریب نہ پھٹکے اور طبیعت کا اضمحلال دور ہو۔

اور کس قدر باعث حیرت واستعجاب ہے یہ امر جس کا ابن سینا نے مرتے وقت ان الفاظ میں اظہار کیا کہ میں نے خالق کائنات کی بارگاہ میں اس امر کا عہد کیا ہے کہ میں تمام قوانین شرعیہ اور احکام اسلامیہ کی تعظیم و توقیر کروں گا (۲) عبادات دینیہ میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ (۳) لہو ولعب کے لئے کبھی شراب کا استعمال نہ کروں گا البتہ تسکین قلب اور معالجۂ امراض کی نیت سے اس کو پی سکوں گا وغیرہ وغیرہ

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے ان مدعیانِ اسلام کے ایمان و اسلام کی حقیقت۔ اور احکام اسلام پر جسارت کیسی بلند آہنگی سے التزام عبادات کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور پھر کس صفائی سے تداوی امراض و تشفی قلوب کے بہانے شراب خوری کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔

یہ ہے تصویر کا دوسرا رُخ۔ اور یہی ہے وہ ایمان جس کا دعویٰ اس قسم کے فلاسفہ و فیلسوف کرتے اور اپنی عبادات و ریاضات کا سبز باغ عوام کو دکھا کر صراطِ مستقیم سے بہکاتے ہیں اور عوام کالانعام اپنی سادہ لوحی کے باعث ان کے دام تزویر کا شکار بن جاتے ہیں۔

پھر ان فلاسفہ کی جانب سے عوام الناس کو بہکانے اور انھیں صراط مستقیم سے ہٹانے کی مؤید ایک اور چیز بھی ہے جس پر ہمیں اور آپ کو غور کرنا ہے۔

اور وہ ہے ان فلاسفہ پر کمزور اعتراضات اور رکیک و یادر ہوا شبہات کی یورش۔ بالخصوص علم ہندسہ و علم منطق کے مباحث و مسائل میں کہ ان میں انھیں مہارت حاصل ہوتی ہے

اور لوتح اور لچر باتوں کی جانب توجہ کرنے کی بجائے وہ انہیں اعتراضات کو اپنی طرف رغبت ومیلان کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔
ہم مضامین سابقہ پر اس مسئلہ پر وضاحت سے روشنی ڈال چکے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ جب میں نے عامۃ الناس کی یہ بدعقیدگیاں اور بے اعتقادیاں دیکھیں اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ اب روز بروز ایمان میں ضعف پھیلتا جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا۔
بفضلہ تعالیٰ میں نے اپنے دل کو اس پر آمادہ پایا کہ ان مبتدعین و مرتدین کے شبہات واعتراضات کا قلع قمع کیا جائے بلکہ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ دین وملت سے منحرف ہونے والوں کو قائل کر دینا اور وہ قائل نہ ہوں تو اُن کی ضد اور عناد کو عوام کے سامنے رکھ دینا یہ کوئی امر مشکل نہیں بلکہ بکرمہ تعالیٰ میں اس خدمت کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہوں۔

اس لئے کہ میں فلسفیوں کے فلسفہ، صوفیائے کرام کے تصوف، باطنیہ کے مسائل تعلیم اور نام نہاد علماء کے طریق کار سے خوب واقفیت رکھتا ہوں اور بہکنے اور بہکانے والوں کی علمی قابلیت اچھی طرح جانتا ہوں۔

ادھر من جانب اللہ میرے دل میں یہ بات القا فرمائی گئی کہ اب بد مذہبی و بدعقیدگی کا مرض متعدی ہو چکا ہے یہ بلا عام ہوتی جا رہی ہے۔ اطباء و حکماء پر بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا ہے۔ مخلوق الٰہی ہلاکت کے کنارے پہنچ چکی ہے اور قوم و ملت کی ناؤ منجدھار میں ہے۔

ایسے وقت میں گوشہ نشینی و عزلت گزینی نہ میرے لئے مفید ہو سکتی ہے اور نہ قوم کو اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔

لیکن اس کے بعد پھر مجھے فاسد خیالات نے گھیرا اور میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیالات آنے لگے کہ اس فتنہ و فساد اور آزادی و غلط روی کے زمانہ میں جبکہ دین و ملت کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے ان بلاؤں کا دفع کرنا اور مخلوق کو گمراہی کی ظلمتوں سے

نکال کر ہدایت کی روشنیوں میں لے آنا ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ اور اسے کوئی استقلال حاصل ہوگا کہ نہیں ؟

اس لیئے کہ اس دور پُر فتن میں لوگوں کو طریق حق کی دعوت دینا اور راہ راست پر بلانا اُن سے شدید مقابلہ کے بتر ادف ہے ۔ اور ایک تن تنہا عامئہ مخلوق سے کس طرح زور آزمائی کر سکتا اور کیوں کر ان پر قابو پا سکتا ہے ۔

اس کار خیر کے لیئے ساز گار حالات کا انتظار یا پھر کسی خدا ترس دین پرور بادشاہ اسلام کی حمایت کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اس بادشاہ کی حق پرستی کے باعث عوام الناس کی کسلمندی دور ہو ۔

ان خیالات نے پھر میرا حوصلہ پست کر دیا اور میں نے بنہایت عجز بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ میرے مولیٰ تو میری اس معذوری و لاچاری سے خوب واقف ہے کہ میں کسی خارجی طاقت و مدد کے بغیر محض اپنے دلائل و مباحث سے اظہار حق کی طاقت نہیں پاتا ۔ مجھے معذور رکھ ۔

لیکن منشائے ایزدی کچھ اور ہی تھا۔ تقدیراتِ الہیہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرتِ خداوندی مجھ سے دین و ملّت کی خدمت لینا چاہتی تھی۔

اس کے لئے غیبی انتظام یہ ہوا کہ کسی خارجی و بیرونی محرک کے بغیر سلطان وقت کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ ان بڑھتے ہوئے فتنوں کے سیلاب کا روکنا سلطانِ اسلام کے فرائض میں داخل ہے اور خلیفۃ المسلمین کو اس کا انسداد لازمی ہے۔

ع؎ امام صاحب کے زمانہ میں ترکوں میں سے سلجوقی خاندان فرماں روا تھا۔ اس خاندان کا سب سے پہلا تاجدار طغرل بیگ تھا جس نے سنہ ۴۵۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان اور الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا جس کے زمانہ میں سلجوقیوں کی حکومت انتہائے شباب پر پہنچ گئی۔ اس کے زمانہ میں امن و امان کی یہ حالت تھی کہ ترکستان سے لے کر شام کی آخیر سرحد تک قافلے بغیر کسی حفاظت کے سفر کرتے تھے اور ایک آدمی تنہا ہزاروں کوس جدھر جاتا چلا جاتا تھا۔

چنانچہ اس امر کی اہمیت کے پیش نظر سلطان وقت نیشاپور پہنچا اور مجھے تاکیدی حکم بھیجا کہ میں اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤں۔

اور یہ حکم اس قدر تاکیدی تھا کہ میں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر انکار کرتا ہوں تو بادشاہ اسلام کی ناراضگی بڑھے گی۔ اور پھر انسانیت سے بھی بعید تھا کہ میں ایسے نازک دور میں بادشاہ وقت کی بات ٹھکرا دوں بالخصوص جبکہ دین و شریعت کی تائید اور بد مذہبی اور گمراہی کی تردید اس کا اصل منشا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۱۹۲) ہزاروں کوس تک جس کا سکہ چلتا تھا چلا جاتا تھا۔

لیکن اس کی حکومت کی عظمت و شان جو کچھ تھی اُس کے وزیر نظام الملک کی بدولت تھی۔ نظام الملک خود صاحب علم و فضل تھا۔ اور اہل علم و فضل کا بڑا قدر دان تھا۔ ابو علی فارمدی جب اُس کے دربار میں آئے تھے تو ہمیشہ اُن کے لئے مسند خالی کر دیتا تھا۔ اسی قدر دانی اور پایہ شناسی نے اس کے دربار کو اہل کمال کا مرکز بنا دیا تھا۔

ادھر مجھے اپنے اس عہد و پیمان کا بھی خیال آیا کہ اب اس کا استحکام ختم ہوتا ہے۔ اور وہ اسباب جن کے ماتحت میں نے گوشہ نشینی کا فیصلہ کیا تھا خود بخود ختم ہو گئے ہیں تو اپنے نفس کی آسائش اور آرام طلبی کے لئے گوشہ نشینی کو بہانہ بنا لینا مروت سے بعید ہے۔

پھر یہ کہنا کہ ہم مخلوق کی اذیتیں برداشت نہیں کر سکتے خود اپنی جگہ ایک ناقابل قبول دلیل ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳) امام صاحب نے سلطان وقت کے نام سے جس کو تعبیر کیا وہ فخر الملک تھا جو نظام الملک کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اور اس زمانہ میں سنجر سلجوقی پسر ملک شاہ کا وزیر اعظم تھا۔ وہ نہایت علم دوست اور پایہ شناس تھا۔ امام غزالی کے تقدس اور جامعیت کا شہرہ سن کر خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت اخلاص و عقیدت ظاہر کی۔ اور اُس کے ساتھ نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ نظامیہ نیشا پور کی مدرسی قبول فرمائیے۔ (الغزالی)

رب تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ...الآية۔

یعنی کیا لوگ اس گھمنڈ میں ہیں کہ اتنی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ کہیں ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہ ہوگی۔ اور بے شک ہم نے اُن سے اگلوں کو جانچا (طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا) تو ضرور اللہ سچوں کو دیکھے گا اور ضرور جھوٹوں کو دیکھے گا (ہر ایک کا حال ظاہر فرمائے گا)

اسی قرآن کریم میں اپنے حبیب پاک صاحب لولاک افضل الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں خطاب فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا..... اَلْاٰيَة۔

یعنی اے محبوب آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا اور اُنھوں نے صبر کیا۔

اور سورۂ یٰسین شریف میں ارشاد ہوا کہ۔

يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

یعنی حکمت والے قرآن کی قسم ۔ بے شک تم سیدھی راہ پر بھیجے گئے ہو (جو منزل مقصود کو پہنچانے والی ہے) ۔ (اور یہ قرآن کریم) عزت والے مہربان کا اُتارا ہوا ہے ۔ تاکہ تم اُس قوم کو ڈر سناؤ جس کے باپ دادا نہ ڈرائے گئے ۔ تو وہ بے خبر ہیں ۔

غرض ان آیاتِ کریمہ کے مضامین نے مجھے جرأت دلائی اور ہمت بڑھائی اور میں نے اپنے مخصوص احباب اور بعض اہلِ کشف اصحاب سے اس باب میں مشورہ طلب کیا ۔ اُن حضرات نے بکمالِ شفقت مجھے یہی مشورہ دیا کہ اب خلوت نشینی اور گوشہ گیری کا وقت نہیں ۔ بلکہ بعض صالحین کو خواب میں بھی یہی القا فرمایا گیا کہ اب خلوت نشینی کا ترک کر دینا ہی ضروری ہے ۔ انشاء اللہ تعالےٰ اس کا منبع و منشا خیر و ہدایت ہے ۔

میرے اس خیال اور اُن حضرات کی تحریک

کی مؤید و مقوی وہ حدیث شریف ہوئی کہ "اللہ تعالیٰ ہر نئی صدی کے آغاز میں ایک مجدد پیدا فرماتا ہے جو دین کی تجدید کرتا ہے۔"
(اور اتفاق سے نئی صدی کے آغاز میں ایک ہی مہینہ باقی تھا۔)

(۱۱) اب میری ہمت بندھ گئی اور ترک عزلت کا میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ اور سابقہ تنہا ذات نے میرے گمان کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اور میں نے

دل انگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

پڑھ کر ذی قعدہ ۴۹۹ھ میں نیشا پور کی طرف اپنا قدم شوق بڑھایا۔ اور اتفاق دیکھئے کہ ۴۸۸ھ کے اسی ماہ میں، میں نے بغداد سے رخت سفر باندھا تھا۔ اس حساب سے گیارہ سال کا طویل عرصہ میں نے گوشہ نشینی میں بسر کیا۔ بغداد سے چلتے وقت میرے دل میں جو خیالات موجزن تھے اُن کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ میری حالت میں کوئی تغیر آ سکتا تھا۔

لیکن اُس قادر مطلق کی قدرتوں کے عجائبات

میں سے میرا یہ اقدام بھی ایک عجوبہ اور تعجب خیز امر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ ایک روز اسپنے اس وطن یعنی بغداد کو چھوڑنا اور اپنے اعزا و اقارب سے منھ موڑنا اور تمام دنیاوی تعلقات کو توڑنا ہوگا۔ مگر اللہ تعالےٰ مقلب القلوب ہے۔ احوال کو پلٹنے والا ہے۔ مسلمان کا دل اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔ جیسا وہ چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔

ہاں، یہاں یہ بات اور سمجھتے چلئے کہ گوشہ نشینی چھوڑ کر نیشاپور کی طرف میری روانگی کا منشاء و مقصود اپنی حالتِ سابقہ کی جانب مراجعت کرنا نہ تھا۔ اس لئے کہ رجوع یا مراجعت کے تو یہ معنی ہیں کہ آدمی وہی پہلا سا منصب یا اپنی سابق حیثیت حاصل کرلے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ میرے سابقہ درس و تدریس کی خدمت میں دنیاوی عزت و وجاہت اور اعزاز و مال کے حصول کو بھی دخل تھا۔ اور میں اپنے کردار و گفتار، قول و عمل سے لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا تھا۔

لیکن میرا درس و تدریس کی طرف یہ اقدام ترکِ جاہ و جلال کے لئے ہے اور رب تبارک و تعالیٰ پر خوب روشن ہے کہ میری یہی نیت ہے اور میں ہمہ تن اسی میں مصروف ہوں کہ خود میرے نفس کی اور دوسروں کی اصلاح ہو۔ اور اس امر کا انجام اسی سمیع و بصیر پر روشن ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہونا کیا ہے۔ ہاں، اس بات پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ :

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

اور اسی سے آپ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس اقدام کی محرکِ حقیقی اُسی مالکِ علی الاطلاق کی قدرتِ کاملہ ہے جس کی مشیئت و ارادہ کے بغیر نہ میں نے کچھ کیا نہ آیندہ کر سکتا ہوں۔

میں بارگاہِ الٰہی میں بنہایتِ ادب عرض کرتا ہوں کہ وہ پروردگار پہلے مجھے صلاحیت بخشے اور میرے ذریعے اوروں کو۔ پہلے مجھے صراطِ مستقیم پر چلائے اور میرے باعث دوسروں کو۔

ہمیں حق حق کی صورت میں دکھائے اور اس کے اتباع کی توفیق بخشے۔

ہمیں باطل باطل کی صورت میں دکھائے اور

اس سے بچنے کی توفیق دے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ
وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

مدعیانِ اسلام کے ایمان کی حقیقت

اب ہم ایمان کو ضعیف کرنے والے مذکورۃ الصدر امور کی طرف رجوع کرتے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو ہلاکت و گمراہی سے نجات دینے والے راستوں کو بیان کرتے ہیں۔

ہم پہلے بتا چکے کہ صراط مستقیم چھوڑ کر بہک جانے والے لوگ کئی قسم پر ہیں۔ تو وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم باطنیہ کی باتیں سن کر حیران ہیں۔ ان کا علاج وہ ہے جو ہم اپنی کتاب قسطاس المستقیم میں بیان کر چکے اور بلحاظ طوالت اس کا اعادہ اس مختصر میں مناسب نہیں۔

اسی طرح اہلِ اباحت کے توہمات، اور شبہات جنھیں سات قسموں میں منحصر سمجھا جاسکتا ہے اُن کے جوابات کیمیائے سعادت میں مذکور ہیں۔ لہٰذا

اس کا ذکر بھی چنداں ضروری نہیں۔

اب رہے وہ لوگ جنھیں فلسفیات سے نے راہِ ہدیٰ سے بہکا کر دولتِ ایمان سے محروم کر دیا ہے۔ یہانتک کہ بعض فلسفہ کے مارے ہوئے اصل نبوت ہی کے منکر ہو بیٹھے ہیں تو ایسوں کو ہدایت کی نیت سے ہم مضامین سابقہ میں بتا چکے ہیں کہ:

(۱) نبوت کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) وہ موجود ہے اور اُس کے وجود پر علم خواص الادویہ اور علم نجوم شاہدِ عادل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلکہ اوراقِ گذشتہ میں ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اسی حقیقت کی تمہید و توطیہ کے طور تھا۔ اس لئے کہ علم طب و نجوم کے مباحث و مسائل پر یقین رکھنے والے جب ان دلائل پر غور کریں گے جو ہم نے وجود نبوت پر قائم کی ہیں تو اُنھیں اپنے علوم سے خارج و بے تعلق نہ پائیں گے۔ بلکہ یہ دلائل بعینہٖ اُنھیں کے دلائل ہیں۔ تو جو فلسفی علوم فلسفہ مثلاً نجوم، طب، طبعیات، سحر اور طلسمات وغیرہ میں سے کسی علم کا ماہر ہوگا اُس کے لئے اُسی کے پسندیدہ علم کے باعث نبوت کے دلائل پر بصیرت حاصل ہوگی

اور بالآخر وہ نبوت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا۔
لیکن جو شخص اپنی چرب زبانی سے دعوئ نبوت کرے کہ نبوت موجود ہے۔ اور اس کے وجود پر اس کے علم میں کوئی معقولی یا منقولی سند و دلیل نہ ہو، بلکہ احکام و مسائل شرعیہ کو حکم و مصالح دنیویہ سے تعبیر کرے کہ یہ تو یونہی ہوتا آیا، یونہی ہوتا رہے گا، تو در اصل وہ حقیقت نبوت سے ناواقف بلکہ حقیقۃً اس کا منکر اور اپنے نفس امارہ و طبیعت مخصوصہ کا پابند و تبیع ہے۔ اور نفس تو یہی چاہتا ہے کہ آدمی ہر امر میں میرا تابع و فرمانبردار رہے۔

ظاہر ہے کہ اس اقتاد و مزاج کا آدمی ایمان بالنبوت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک ایسے طور کے ثبوت و وجود کا اقرار کرے جو عقل سے برتر و بالا ہے اور جس کے باعث وہ آنکھیں کھل جاتی ہیں جن سے ایسے معلومات کا ادراک حاصل ہوتا رہتا ہے جن کو عقل کی خود بین کے ذریعہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ عقل ان کی دریافت میں ایسی ہی نکمی اور عاجز ہے جیسے قوت سامعہ رنگ و اشکال کی دریافت سے

اور قوتِ باصرہ ادراکِ اصوات سے، اور حواسِ خمسہ ادراکِ معقولات سے محروم و معزول ہیں۔

اب اگر کوئی شخص اِسے نہیں مانتا تو نہ مانے ورنہ یہ اجمالی اشارے نبوت کے امکان بلکہ اُس کے وجود پر دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو اِسے تسلیم کرتا ہے کہ ادویات میں بعض وہ خاصیتیں موجود ہیں جو کسی طرح عقل میں نہیں آتیں۔ اور اسی لئے عقل ان کی تکذیب کرتی اور محال سمجھتی ہے۔ حالانکہ وہ موجود ہیں اور بداہتہً اُن کے آثار مشاہدے میں آتے ہیں۔

مثلاً افیون کی ایک مقررہ مقدار سمِ قاتل و زہرِ ہلاہل ہے۔ اس لئے کہ اس کی برودت کی کثرت کے باعث خون رگوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔

اب اگر کوئی علم طبعیات کا واقف کار یہ دعویٰ کرے کہ اجسامِ مرکبہ میں برودت کا ذریعہ صرف پانی اور مٹی کے عناصر ہیں کہ یہی دونوں بارد ہیں اور اس کے علاوہ اجسام میں کسی اور چیز سے برودت پیدا نہیں ہو سکتی تو کوئی عقلمند اِس بات کو قبول نہیں کر سکتا اور وہ صرف اس لئے کہ ہم اس بات کا یقین رکھتے

ہیں کہ کوئی شخص اگر سیر دو سیر مٹی کھا جائے تو اس کے جسم میں اتنی برودت پیدا نہیں ہو سکتی جتنی ایک آدھ تولہ افیون سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ افیون میں جس قدر اجزاء ہیں وہ پانی اور مٹی ہی کے اجزاء ہیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ پانی اور مٹی وہ برودت بدن میں پیدا نہیں کر سکتے جو افیون خون میں پیدا کر دیتی ہے۔ بالخصوص جبکہ پانی اور مٹی میں اجزاء ناریہ اور ہوائیہ منضم ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اب اُن کی تاثیر میں اور بھی فرق پیدا ہو جائے گا۔

اب افیون سے بدن میں اس قدر برودت کے بڑھ جانے کو کوئی شخص محال بتائے اور اُس پر یہ دلیل پیش کرے کہ کیونکہ افیون میں اجزائے ناریہ و ہوائیہ ہیں اور اجزائے ناریہ و ہوائیہ برودت پیدا نہیں کر سکتے اس لئے افیون بھی برودت پیدا نہیں کر سکتی ظاہر ہے کہ ایک لغو اور لایعنی دلیل ہے۔

ہمیں اپنے مدعا کے اثبات پر ایک یہی دلیل برودت کافی ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ الٰہیات و طبعیات کے مباحث میں بکثرت ایسی دلیلیں پائی جاتی ہیں جنھیں مشاہدہ رد کر دیتا ہے۔ اور وہ غلط و باطل

ٹھہرتی ہیں۔

دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ فلاسفہ نے ہر امر کی نسبت وہی حکم لگایا جو اُن کی ناقص عقل میں سمایا اور یہی وجہ ہے کہ جو چیز اُن کی دریافت و ادراک میں نہیں آتی وہ اس چیز کی ضرورت بلکہ وجود ہی سے منکر ہو بیٹھتے اور اُسے محال و ناممکن ٹھہرا دیتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اگر رویائے صادقہ یعنی سچی خوابیں جن کی صداقت پر تجربہ و مشاہدہ شہادت دیتے ہیں عالم وجود میں نہ آتیں تو اپنی اندھی اور اوندھی عقلوں پہ اعتماد کلی کرنے والے اس حقیقت کو تسلیم کرنے والے نہ تھے کہ جب حواس معطل اور ناکارہ سے رہ جاتے ہیں تو انسان پر غیب کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ بسا اوقات آیندہ کے واقعات معلوم و دریافت کر لیا کرتا ہے۔

اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں ایک چیز ایسی بھی پائی جاتی ہے کہ اگر وہ معمولی مقدار میں کسی شہر یا بستی میں رکھ دی جائے تو وہ تمام شہر کو ویران و برباد کرنے کے بعد خود بھی ختم ہو جائے تو اس قسم کے لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرتے اگر ان کی آنکھوں کے سامنے آگ کی ایک چنگاری کا کرشمہ نہ ہوتا۔

ظاہر ہے کہ اس ناقابل انکار حقیقت کا انکار کر دینا۔ بلکہ اُسے محال اور از قبیل خرافات بتانا اس حقیقت پہ کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ نہ ہونا اور بات ہے اور نہ جاننا اور بات۔

پس یونہی سمجھ لیجئے کہ عجائبات آخرت اور امور اُخروی کا انکار بھی اسی قسم کا انکار ہے۔ اب ہم ایک طبعی اور فلسفی سے یہ کہتے ہیں کہ جس طرح دلائل ومشاہدات اور تجربات سے تم نے آخر کار یہ تسلیم کر لیا کہ افیون میں ایک خاصیت تبرید بھی موجود ہے اور وہ جسم میں دوران خون کو منجمد کر دیتی ہے۔ اگرچہ علم طبعیات کے اعتبار سے یہ چیز قرین قیاس نہیں اسی طرح تمہیں یہ امر بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ احکام واوضاع شرعیہ میں بھی امراض قلبیہ کے علاج اور تصفیۂ قلوب وصفائی باطن کے وہ خواص پائے جاتے ہیں جو حکمت عقلیہ سے معلوم نہیں ہو سکتے بلکہ چشم نبوت ہی ان کا معائنہ کر سکتی ہے۔

ایک اور مثال جو حکماء کی کتابوں میں مندرج ہے ہمارے مقصود پہ دلیل ہے۔ اور وہ ہے پندرہ[۱۵] کا نقش جو اعداد و حروف میں مندرجہ ذیل طریقہ پہ

پر کیا جاتا ہے:-

و	ا	ح
ز	ہ	ج
ب	ط	د

۶	۱	۸
۷	۵	۳
۲	۹	۴

اس شکل میں نو خانے ہیں جن میں علیحدہ علیحدہ
اعداد یا حروف لکھے جاتے ہیں۔ اور عجیب یہ ہے کہ
دائیں بائیں نیچے اوپر غرض جدھر سے جوڑا جائے،
حاصل جمع پندرہ ہوتے ہیں۔ اور حکماء نے اس کی عجیب
وغریب خاصیت بیان کی ہے۔ مثلاً دو کوری ٹھیکریوں
پر یہ نقش لکھ کر اگر حاملہ کو دیا جائے اور وہ اسے دیکھتی
رہے تو بچہ بآسانی پیدا ہو جاتا ہے۔

یا للعجب! وہ عقل جو اس نقش کی تاثیر کو تسلیم کرتی
ہے اس امر کی تصدیق میں کیوں متامل رہتی ہے کہ مثلاً فجر کی
دو ظہر اور عصر کی چار اور مغرب کی تین رکعتوں میں بھی کچھ
ایسے ہی نامعلوم خواص ہیں جو چشم حکمت سے نہیں بلکہ نگاہِ نبوت
سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس کا سبب نماز
کے اوقات کا اختلاف ہے۔

واعجباہ! اگر ایک نجومی یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ جب آفتاب وسط آسمان میں ہوتا ہے تو طالع کا حکم اور ہوتا ہے اور جب آفتاب غارب میں ہو مائل بہ زوال ہو جائے تو اس کا حکم اور ہے اور ان اختلافات کا جنم پتریوں اور عمروں بلکہ عملوں پر اثر پڑتا ہے۔ تو علم نجوم پر اعتقاد رکھنے والا فوراً اُس کی تصدیق کر دیتا ہے۔ اگرچہ بارہا نجومیوں کے دعوے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی نجومی یہ کہہ دے کہ جب آفتاب وسط آسمان میں ہو اور فلاں بُرج میں فلاں ستارہ اُس کے مقابل آجائے تو اُس وقت جو شخص نیا کپڑا پہنے گا وہ اُسی کپڑے میں ہلاک ہو جائے گا تو علم نجوم بلکہ منجمین کا معتقد فوراً اُسے مان لے گا اور اُس ساعت میں نیا کپڑا استعمال نہ کرے گا۔ اگرچہ اُسے سردی میں مرنا پڑے۔

غور فرمائیے نجومی کی بات کی تصدیق صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ علم نجوم کا مسئلہ ہے۔ ورنہ سورج مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ طلوع کر رہا ہو یا مائل بزوال ہو اُسے اِس قسم کے مسائل میں کیا دخل ہو سکتا ہے۔

پھر کیسے تعجب کی بات ہے کہ جب عقل علم نجوم کے اِن عجائبات و خواص سیارات کو قبول کرتی اور اِن خواص کی معرفت کو بعض انبیاء کا معجزہ مانتی ہے تو اسی قسم کے اور مسائل پر جنہیں خود نبی اللہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں کیوں ایمان نہیں لایا جاتا بالخصوص جبکہ نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت بھی نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً جب کہ معجزات اُس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بس تو تعداد رکعات، سعی بین الصفا والمروۃ، طوافِ خانۂ کعبہ اور رمی جمار میں بھی کچھ ایسے ہی خواص ہیں۔ اور اِن عبادات کے خواص خواصِ دویہ اور خواصِ نجوم میں اِس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ انھیں مانئے انھیں تسلیم نہ کیجئے۔

یہاں اگر کوئی فلسفی یہ کہے کہ ہم نے نجوم و طب کے مسائل کا تجربہ و تجزیہ کیا اور انھیں اپنے خواص میں صحیح و درست پایا۔ اس سے ہم ان کی تصدیق نا دانستہ طور پر نہیں کرتے ہیں بلکہ اُنھیں مطابق واقعہ پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ باتیں ذہن نشین ہو کر دل میں گھر کر گئی ہیں، اور اِن علوم کے وعادی میں کوئی استبعاد ہمیں نظر

نہیں آتا برخلاف احکام و اوضاع شرعیہ۔ کہ ہمیں ان کا تجربہ نہیں۔ اب اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ ان میں اُن خواص کا پایا جانا ممکن ہے تو امکان کے قول سے اُن کا وجود و تحقق کس طرح ثابت ہوگا۔

ہم اس کے جواب میں اتنا ہی کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ آپ نے علم نجوم کا خود کوئی تجربہ نہیں کیا بلکہ تجربہ کاروں نے جب اپنے تجربات کی خبر آپ کو دی تو آپ نے اُن کا یقین کرلیا اور ان امور میں اُنہیں کی تقلید آپ کو اختیار کرنی پڑی۔ تو کیا یہ آپ کا اخلاقی فرض نہیں کہ آپ علم شریعت کے بارے میں انبیاء کرام و اولیاء عظام کے اقوال سنیں اور اُن پر یقین کریں اس لیے کہ ان حضرات نے شرعیات کا چشم دل سے مطالعہ اور اُن کی حقانیت کا مشاہدہ کیا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جسے اختیار کرنے پر آپ بھی ان حقایق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

پھر ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ اگرچہ خواص ادویہ کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں رکھتے لیکن پھر بھی اُس کی تصدیق کرنا آپ پر اخلاقاً فرض ہی ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ عقلِ سلیم کا تقاضا ہی یہ ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک عاقل آدمی بالغ ہوتے ہی بیمار پڑ جائے اور اُس کا شفیق باپ طبیب حاذق ہو جس کے طبی کمال کی شہرت یہ لڑکا اپنے سنِ شعور سے سُنتا آ رہا ہو اب وہ شفیق باپ اپنے بچے کے لئے ایک معجون تیار کرے اور بیٹے سے کہے کہ تیرے مرض کی یہ دوا ہے اور اس کے استعمال سے تجھے شفا حاصل ہو گی تو اب آپ بتایئے کہ وہ لڑکا اس وقت کیا کرے آیا وہ اپنے مہربان باپ کی بات کی تصدیق کر کے اُس دوا کو کھا لے اگرچہ وہ کڑوی ہو یا اُس کی تکذیب کر کے اُس دوا کے استعمال سے پرہیز کرے اور یہ کہدے کہ اس دوا کو شفا سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ یہ بات نہ میری عقل میں آتی ہے اور نہ میں یہ مان سکتا ہوں اس لئے کہ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔

کیا ایسی صورت میں آپ اُس کے اس انکار اور اپنے تجربہ کے ادعا پر آپ اُسے بیوقوف نہیں سمجھیں گے۔ اگر ہاں تو بتلایئے کہ ایسے نبی رؤف و رحیم کی مجوزہ معجون کے استعمال میں توقف کرنیوالے اور صحت روحانی کے لئے اُسے استعمال نہ کرنے والے ارباب بصیرت کی نگاہوں میں کیوں نہ سفیہ ٹھہریں۔

اگر کوئی احمق یہ کہے کہ نبی اللہ کا مہربان اور طب روحانی سے واقف ہونا کیونکر معلوم ہو؟ تو اوس سے کہا جائے گا کہ تونے اپنے باپ کی مہربانی و شفقت کو کیونکر پہچانا۔ کیا اُس کی شفقت محسوس ہے جو حواس سے معلوم ہو سکے۔ نہیں۔ بلکہ احوال کے قرائن اور اعمال کے شواہد جو اُن کی نشست و برخاست و آمد و رفت سے روزانہ ہویدا ہوتے رہتے ہیں وہ ہمیں اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ والدین اپنی اولاد پر مہربان و شفیق ہوتے ہیں۔ اور یہ یقین دل میں کچھ اس طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ جانب خلاف کا ادنی سا شبہہ بھی نہیں گزرتا۔

ہاں ہاں! جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اپنی نگاہ میں رکھتا ہے اور جس کی نظروں میں آپ کے وہ احوال ہیں جو عامۂ خلائق کی اصلاح و ہدایت اور عوام الناس پر محبت و شفقت کے بارے میں وارد ہوئے وہ خود ہی اس حقیقت کا اعتراف کریگا کہ نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کس درجہ شفقت و محبت اور حسن اخلاق سے لوگوں سے پیش آتے تھے۔ اور روئے زمین سے فتنہ و فساد کی بیخ کنی کی جانب جس قدر اہتمام فرماتے تھے اُس کا ماحصل

یہ ہے کہ دین و دنیا کی سعادت جن امور پر موقوف ہے ان سب کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

غرض حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ و سیرت کریمہ و رحمت عامہ کا مطالعہ کرنے والا خوب جانتا ہے کہ آپ کو اپنی عام امت سے جو محبت و شفقت تھی اور ہے وہ اوس سے کہیں بڑھ کر ہے جو ایک باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

ع اللہ کے پیارے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کو یاد کیا جائے تو واللہ العظیم باپ، استاد، پیر، آقا، حاکم، بادشاہ وغیرہ وغیرہ تمام جہان کے احسان جمع ہو کر ان کے احسانوں کے کروڑویں حصے کو نہ پہنچ سکیں۔

وہ وہ ہیں کہ شکم پاک مادر سے جدا ہوتے ہی سجدے میں گرے ہیں اور اپنے رب کی وحدانیت، اپنی رسالت کی شہادت کے بعد سب میں پہلی جو یاد آئی وہ امت ہی کی یاد تھی اور نرم نازک حزیں آواز سے

بالخصوص جبکہ آدمی اُن افعال و اقوال پر نظر ڈالے جن میں اُمورِ غیبیہ اور واقعات آئندہ کی اطلاع دی گئی ہے اور قرآن کریم وحدیث شریف اُن پر شاہد عادل ہے یعنی وہ الفاظ قرآن کریم واحادیث نبویہ موجود محفوظ ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۱۴)

کہتے تھے رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ۔ اے میرے رب میری اُمت میری اُمت!

وہ وہ ہیں کہ اُس پیارے حبیب رؤف ورحیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو جب قبرِ انور میں اُتارا ہے تو لبہائے مبارک جنبش میں ہیں۔ فضل یا قثم بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کان لگا کر سُنا ہے آہستہ آہستہ عرض کر رہے ہیں رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ۔

وہ وہ ہیں کہ تم چادر تان کر شام سے خراٹے لیتے صبح کی خبر لاتے ہو اور وہ پیارا بے گناہ بے خطا ہے کہ تمہارے لئے راتوں جاگا کیا تم سوتے ہو اور وہ زار زار رو رہا ہے روتے روتے صبح کر دی ہے کہ رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ!

وہ وہ ہے کہ تمہاری لاکھ لاکھ نافرمانیاں دیکھتے ہیں پھر بھی تمہاری محبت سے باز نہ آئے (باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

تو یقیناً اُسے یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ طور جو عقل سے برتر و بالا ہے بدرجۂ کمال حاصل تھا۔ اور آپ کی چشمِ بصیرت میں اللہ تعالےٰ نے وہ وسعت عطا فرمائی تھی کہ امورِ غیبیہ اور خواص عبادات و اوضاعِ شرعیہ کے مصالح آپ پر روشن رہتے تھے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں بلکہ یہاں عقل تھکی رہ جاتی اور یہی ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر چل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا اور آپ کی تصدیق کرنا لازم و فرض بلکہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پھر حاضر ہیں کیا حجت بہ یہ ہے قرآن کریم اور یہ ہے احادیث کریمہ۔ اب غور سے ان کا مطالعہ

(حاشیہ صفحہ ۲۱۵) دیکھو وہ فرماتا ہے کہ تم پروانے کی طرح آگ پر گرے پڑتے ہو اور میں تمہارا کمربند پکڑ کر روک رہا ہوں۔ کیا کبھی کسی کے باپ، اُستاد، پیر، آقا، حاکم، بادشاہ نے بیٹے، شاگرد، مرید، غلام، نوکر، رعیت کا ایسا خیال کیا ایسا درد دکھایا ہے۔ استغفر اللہ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ
وبارک علیہ وعلیٰ
الہ ابداً

کر لیجئے آپ پر نبوت کی صداقت خود ہی عیاں و مستغنی عن البیان ہو جائے گی۔

بہرحال ایک فیلسوف یعنی مدعیٔ اسلام ہو کر شرعیات میں مباحث فلسفہ کو داخل کر کے، فلاسفہ کے اقوال کی تصدیق کرنے والے کے لئے اسی قدر بیان کافی و وافی ہے۔ اور اس زمانہ میں ان مباحث و معلومات کی شدید ضرورت ہے۔

اب اُن چار گروہوں میں سے صرف ایک گروہ علماء سو کا باقی رہتا ہے اور دراصل یہ لوگ بھی عوام کے لیئے دین و ملت سے لاپرواہی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور اس قسم کے لوگوں کا علاج تین طرح کیا جاسکتا ہے۔

(۱) جب تم کو کسی مدعیٔ علم کے متعلق یہ بات معلوم ہو کہ وہ مثلاً مال حرام کھاتا ہے تو اُس کے اس فعل کو حرام مال کے حلال ہو جانے پر دلیل مت جانو اور اُس کی ریس میں تم حرام مال کی تحصیل میں عمر مت گنواؤ بلکہ اپنے نفس کے رذائل اور اپنے باطنی عیوب پر ایک نگاہ ڈالو۔ دیکھو خدانخواستہ اگر تم میں سے کوئی شخص شراب نوشی کا عادی ہے یا معاذ اللہ وہ سود کا روپیہ حاصل کرتا

ہے یا نہ ہی خود تمہارے اندر غلیبت جھوٹ اور حسد جیسی برائیاں پائی جاتی ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ مسلمان شرابی یا سود خوار یا خود تم غلیبت و کذب کے مرتکب ہو کر شراب خوری وسود یا غلیبت و حسد کو حلال وجائز سمجھنے لگے ہو۔ نہیں، تم ان کی حرمت کے اب بھی قائل ہو۔ مگر اِن افعال اپنی شامتِ اعمال تصور کرتے اور جانتے ہو کہ یہ خواہشاتِ نفسانیہ کے اتباع کا نتیجہ ہیں۔ بعینہ یہی گمان اُس مدعیِ علم پر کرو کہ خواہش نفسانی نے غلبہ پاکر اُسے اس حرام خوری پر آمادہ کر دیا ہے۔ اور یہی مرض یعنی غلبۂ خواہشات نفسانیہ تمہارے اندر بھی پایا جاتا ہے تو یہ تو بڑی بے انصافی ہوگی کہ اس فعل کے صدور پر تم اپنے اوپر بھی ملامت نہ کرو۔ لیکن جب کسی عالم کو اس میں مبتلا پاؤ یا اس کی خبر سن پاؤ تو اب تمہاری نگاہوں میں اُس عالم سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی مجرم نہ رہے اور تم بات بات میں اُس پر طعن وتشنیع شروع کر دو حالانکہ عالم عالم ہے اور عامی عامی۔

ــه قرآن عظیم ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا الآیۃ۔ یعنی پھر ہم نے وارث کیا اپنے چنے ہوئے بندوں کو۔ (باقی صفحہ ۲۱۹ پر)

کیا تمہاری نظروں نے کبھی ایسا مریض نہیں دیکھا
جو اپنے معالج کو طبیب حاذق و حکیم صادق جانتا ہے
لیکن اس کے باوجود وہ بعض پھلوں یا غذاؤں یا سردپانی
کو بے صبری یا چوری چھپے استعمال کر بیٹھتا ہے حالانکہ
حکیم حاذق نے اس سے پرہیز کی تاکید کی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ۲۱۸) اُن میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے
اور کوئی متوسط حال کا اور کوئی بحکم خدا بھلائیوں میں بیشی
لیجانے والا۔ یہی بڑا فضل ہے۔"
دیکھئے بے عمل عالم (جبکہ عقائد حق پر مستقیم اور حق وہدایت
کی طرف داعی ہو گمراہ اور گمراہی کی طرف بلانے والا وارث
نبی نہیں نائب ابلیس ہے والعیاذ باللہ تعالیٰ) کہ گناہوں سے
اپنی جان پر ظلم کررہے ہیں قرآن کریم نے انھیں بھی کتاب کا
وارث بتایا۔ اور نرا وارث ہی نہیں بلکہ اپنے چنے ہوئے
بندوں میں گنا۔ احادیث میں آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا سابقنا سابق۔ ومقتصدنا ناجٍ
وظالمنا مغفورٌ۔ ہم میں کا جو سبقت لے گیا وہ تو سبقت لے ہی
گیا اور جو متوسط حال کا ہوا وہ بھی نجات پانے والا
ہے اور جو اپنی جان پر ظالم ہے (باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

لیکن مریض کے اس فعل بد پرہیزی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ چیزیں اس کے لئے ضرر رساں نہیں، یا طبیب کی تشخیص و طریقہ علاج پر اسے اعتماد نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُسے اپنے نفس پر قابو نہیں خواہشاتِ نفسانیہ کے غلبہ نے اسے بے صبرا بنا دیا ہے۔

یہی حال علماء کی ظاہری لغزشوں کا ہے۔

(۲) دوسرا علاج یہ ہے کہ ایسے ضعیف الایمان لوگوں سے یہ کہا جائے کہ بھئی تم میں اور ایک عالم میں بڑا فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عالم دین نے اپنے علم کو آخرت کا توشہ بنا لیا ہو یعنی یہ کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ آخرت میں میرا یہ علم میری شفاعت کر کے میری مغفرت کرائے گا اور اس گمان میں پھنس کر وہ اعمال میں تساہل و غفلت سے کام لیتا ہے۔ لیکن کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہو بھی جاوے بلکہ

(حاشیہ صفحہ ۲۱۹) اُس کی بھی مغفرت ہے والحمد للہ (عقیلی بیہقی)
عالم شریعت اگر اپنے علم پر عامل بھی ہو چاند ہے کہ آپ ٹھنڈا اور تمہیں روشنی۔ ورنہ شمع ہے کہ خود جلے مگر تمہیں نفع دے ۱۲ (مقال العرفاء) مترجم عفی عنہ

ممکن ہے کہ رب عزّوجل جس نے محض اپنے فضل وکرم سے علماء کو درجوں بلند فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے، اس کے تمام گناہوں پر پردہ ڈال کر اُسے بخش دے۔ لیکن تم اپنی تو کہو کہ تمہارا کیا حال ہوگا؟ تمہارے پاس تو وہ علم وفضل بھی نہیں اور ایک بدعمل عالم کو دیکھ کر بظاہر اُس کی لیکن درحقیقت خواہشاتِ نفسانیہ کی تقلید میں عمل چھوڑ بیٹھے ہو۔ تمہاری نجات کی کیا صورت ہے۔ اور وہاں تمہاری شفاعت کرنے والی کونسی چیز ہوگی ——؟

(۳) تیسرا اور حقیقی علاج یہ ہے کہ ہمیں اس امر کا یقین ہونا چاہیئے کہ ایک عالمِ دین حتی الامکان گناہ کبیرہ سے پرہیز کرتا ہے اور اس سے دور دنفور رہتا ہے بلکہ عالمِ دین کی تو یہ شان ہے کہ صغیرہ گناہوں پر اصرار بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ معصیت ونافرمانی زہر قاتل ہے۔ اور عالمِ آخرت دُنیا سے افضل وبالا ہے۔

اور جس شخص کے علم میں یہ بات ہوگی وہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے عوض اور عالی کو ذلیل کے بدلے میں فروخت نہیں کرسکتا۔ ہاں، کسی لغزش کا صادر ہونا یہ اور بات ہے۔

مگر یہ نورِ علم ان علوم سے حاصل نہیں ہوتا جن میں آج دنیا منہمک ہے۔ بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ موجودہ علوم نے عوام و خواص کو معصیت و نافرمانی پر اور زیادہ جری و بے باک بنا دیا ہے۔ اس کے برخلاف علمِ حقیقی صاحبِ علم پر خشیت و خوفِ الٰہی طاری کر دیتا ہے اور یہی خشیتِ الٰہی وہ چیز ہے جو ایک عالم اور معصیت کے درمیان حاجب و سدِ راہ بن جاتی ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے ابھی بتایا کسی عالم سے لغزشوں کا صدور محال و ناممکن الوقوع نہیں۔ عالم بہرحال ایک بشر ہے اور بشریت کے لئے عصمت لازم نہیں۔ الغرض نتیجہ یہ نکلا کہ ان لغزشوں کو کسی عالمِ دین کے ضعفِ ایمان پر دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اہلِ ایمان کا امتحان لیا جاتا ہے وہ کسی بلا میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر وہ اپنی اصل کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ مسلمان رقیق القلب ہوتا ہے معصیت اُس میں گھر نہیں کر سکتی۔

یہ ہیں میرے وہ خیالات جو میں فلاسفہ اور اہلِ تعلیم اور ان دونوں پر غلط رد کرنے والوں کے رد میں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

اب میں اپنی کتاب کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ وہ کریم اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنے برگزیدہ بندوں کے کفش برداروں میں شمار فرمائے اور ہمیں اونہیں حضرات کے نقش قدم پر چلائے جو راہِ حق میں گامزن اور یادِ مولیٰ میں شب و روز مشغول رہتے ہیں اور ذکر الٰہی سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ خواہشاتِ نفسانیہ کے اتباع سے دور و نفور ہیں اور وساوس شیطانیہ سے بری و بیزار۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا
وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

تمت

حرف آخر

یہ مانا میرے جرموں کی نہیں ہے کوئی حد شاہا
مجھے تسلیم اپنی ہر خطا بے رد و کد شاہا
مگر تم چاہو تو ہر جرم نیکی سے بدل جائے
کہ دیوانِ شفاعت میں تو ہے ایسی بھی مد شاہا

(حضرت محی بنامی)

المنقذ من الضلال

20

اردو

مصنفہ

حجۃ الاسلام حضرت محمد بن محمد الغزالی الطوسی رحمۃ اللہ علیہ

مترجمہ

خلیل العلماء حضرت مولانا مفتی محمد خلیل خاں صاحب قادری برکاتی
صدر المدرسین مدرسہ احسن البرکات حیدرآباد پاک

دین دنیا بک ڈپو شاہی بازار حیدرآباد سندھ پاک